اجنبی لڑکی
توصیف

۱۹۵۹ء میں مسلم یونیورسٹی سٹی ہائی اسکول کے سالانہ مجلّے میں پہلی کہانی شائع ہوئی۔ ۱۹۶۰ء میں اسی سالانہ مجلّے کا ایڈیٹر مقرر ہوا۔ ۱۹۶۱۔ ۱۹۶۴ء علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا طالب علم رہا، جہاں ممتاز و معروف اساتذہ محترم ڈاکٹر قاضی عبدالستار صاحب، محترم خلیل الرحمٰن اعظمی صاحب، محترم معین احسن جذبی صاحب اور محترم آلِ احمد سُرور صاحب سے تعلیم حاصل کرنے اور قربت کا اعزاز حاصل ہوا۔ محترم قاضی عبدالستار صاحب کی شخصیت سے متاثر ہوا، ادبی ماحول نے جِلا بخشی۔ ۱۹۶۴ء میں پہلا افسانوی مجموعہ "کچھ نوحے، کچھ گیت" دہلی سے شائع ہوا۔ اِس مجموعے کا دیباچہ محترم قاضی عبدالستار صاحب نے ازراہِ لطف و کرم تحریر فرمایا۔ کچھ ماہ بعد ایک ناولٹ "سپنوں کی موت" لکھا جو دہلی ہی سے شائع ہوا گویا ۲۱ سال کی عمر میں دو کتابوں کا مصنف بن گیا۔ ۱۹۶۴ – ۱۹۶۹ء کا وقت حیدرآباد سندھ میں گزرا جہاں سندھ یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ ریڈیو کے لیے گیتوں بھری کہانیاں، فیچر اور افسانے تحریر کیے۔ ۱۹۶۷ء میں حیدرآباد سندھ سے ایک مجلّہ "یادیں" شائع کیا۔ ۱۹۶۹ء میں حیدرآباد ہی سے ایک اور ناولٹ "ساحل سے دور" شائع ہوا۔ ۱۹۷۰ء میں کراچی چلا آیا۔ ۱۹۷۰ء سے ۱۹۸۶ء تک تین کتابیں، آٹھ اسٹیج ڈرامے اور تقریباً ۴۵ افسانے تحریر کیے۔ اس دوران قومی اخبارات میں بے شمار شخصیات کے انٹرویوز، مضامین شائع ہوئے۔ اس مجموعے میں ۱۹۷۰ء – ۱۹۸۶ء تک کے افسانوں کا انتخاب شامل ہے جو زیادہ تر ہندوستان کے ادبی رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔

توصیف چغتائی

اپنی لڑکی

(افسانوں کا مجموعہ)

اجنبی لڑکی

(افسانوں کا مجموعہ)

توصیف چغتائی

کتاب :۔ اجنبی لڑکی

مصنف :۔ توصیف چغتائی

سرورق :۔ ندیم

ناشر :۔ نتاشا کومیونیکیشن ۔ کراچی

کتابت :۔ حافظ محمد اکرم راشد

طبع اوّل :۔ ۱۹۸۷ء

قیمت :۔ چالیس روپے

طباعت :۔ ایجوکیشنل پریس پاکستان چوک کراچی

نتاشا

NATASHA COMMUNICATION
Publication Division

H-3/M.Y. SQUARE, Block G.
North Nazimabad
Karachi.

"آصف جیلانی کے نام ——— !"

شماریہ

نام :۔ توصیف چغتائی

پیدائش :۔ علی گڑھ (یو پی) ہندوستان

جہاں تعلیم حاصل کی :۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، سندھ یونیورسٹی

پیشہ :۔ ملازمت

مطبوعہ تخلیقات :۔ سات

سرِ لفظ

یہ ۱۹۵۹ء کے کسی مہینے کی بات ہے۔ آسمان کی نیلگوں وسعتوں پر پورا چاند دہک رہا تھا اور میں اس دن بے انتہا بے چین تھا۔ نیند کوسوں دور تھی۔ اچانک انکشاف ہوا کہ لفظ میرے چاروں طرف شور مچانے لگے۔ لفظوں کے اس شور نے میرے ذہن میں ہل چل مچا دی۔ پھر میں آنکھیں ملتا ہوا اٹھا اور لفظوں سے دوستی کر لی۔

لفظ جو انسانیت کا شرف ہیں۔ سچے اور زندہ لفظ جو زندگی کی سچائی کے سفر کا اشاریہ ہیں۔ وہی لفظ میرے دوست، میرے ہمدم، میرے غمگسار بن گئے۔

۱۹۵۹ سے کر اب تک میں نے بہت کچھ لکھا۔ جب میں لکھنے میں بیٹھتا ہوں تو یہی لفظ میرے خون میں شامل ہو کر سیاہی کا روپ دھار لیتے ہیں۔ انسانوں کے دکھ درد محسوس کرتے ہوئے یہی لفظ آنسو بن کر میری آنکھوں میں امڈ آتے ہیں۔ پھر یہی لفظ میرے ذہن کے دریچوں میں ہل چل مچا دیتے ہیں۔

لفظ ہنساتے بھی ہیں، لفظ رلاتے بھی ہیں، لفظ دکھ بھی دیتے ہیں اور خوشیاں بھی عطا کرتے ہیں۔ —— لفظ میرا اثاثہ ہیں، لفظ میرا سہارا ہیں۔ یہی لفظ خدا سے مجھے ملاتے ہیں اور بندگی کا احساس دلاتے ہیں کٹھن وقت میں یہی لفظ میرے لیے پل صراط بھی بن جاتے ہیں۔

لفظ جو زندگی کی سچائی ہیں، قدرت کا حسن ہیں۔ یہی لفظ میرے دوست ہیں۔ ان ہی لفظوں کی دوستی نے مجھے قلمکار بنا دیا اور میں نے اب تک جو کچھ لکھا اگر اسے ایک جگہ ایک کہانی کا روپ دے دیا جائے تو وہ میری آٹو گرافی بن جائے۔

میں جو کچھ لکھتا ہوں سچ لکھتا ہوں ۔ ذاتی زندگی میں بھی میری یہی کوشش رہتی ہے کہ سچ بولا جائے۔ سچ لکھنا اور سچ بولنا بڑی اذیت ناک بات ہے کیونکہ اس منافق معاشرے میں آدمی سچ بول کر اپنی راہوں میں کانٹے بوتا ہے اور اس کا سراپا لہولہان ہو جاتا ہے ۔ جھوٹا آدمی مکار اور کمینہ ہونے کے ساتھ ساتھ بزدل بھی ہوتا ہے اور خدا کا کرم ہے کہ میں بزدل ہوں نہ کمینہ ۔

لفظوں نے مجھے جہاد کرنا سکھا دیا ہے ۔ زندگی کی سچائیوں کے لیے ۔ دکھی انسانیت کے لیے اور ان کے لیے جو میرے اپنے ہیں ۔

توصیف چغتائی

"—— کچھ لوگ زندگی میں دل سے جتنے قریب ہوتے ہیں کبھی وہ اچانک اتنے اجنبی بن جاتے ہیں کہ زندگی ایک المیہ بن جاتی ہے۔ ایک ایسی ہی لڑکی کا فسانہ جو دولت کے سنہری جال میں پھنس کر تمام رشتوں کو بھلا بیٹھی، اور ایک دن —— اوہ خداوندا ——"

اجنبی لڑکی

۲ اور خداوند نے کہا، "مجھے اپنے بندوں پر دوبارہ ہنسی آتی ہے۔ ایک بار اس وقت جب میں جسے بگاڑنے پر تلا ہوا ہوں، وہ اپنے آپ کو بنانے کی کوشش میں مصروف ہو، اور دوسری بار اس وقت جسے میں بنانا چاہوں، لیکن وہ اپنے آپ کو تباہ کرنے پر آمادہ ہو۔"

سورج غروب ہونے کو تھا اور مغربی کنارے پر آسمان پر شفق کی لالی پھول رہی تھی۔ اس نے کھڑکی سے پردہ اٹھا کر ڈوبتے ہوئے سورج اور پھولی ہوئی شفق کو دیکھا۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے سورج کو رات کے دیوتا نے اپنی خوابگاہ میں قتل کر دیا ہو اور سورج کے جسم کا سارا خون بکھر کر آسمان پر پھیل کر جم گیا ہو، "قتل، قتل، قتل۔۔!" وہ چیخنے لگا۔ اس کی آواز سن کر امی اس کے کمرے میں گھبرائی ہوئی آئیں اور انہوں نے اسے دیکھ کر ایک ٹھنڈی آہ بھری ـــــ "یا خدا! اپنا رحم کر اس جوانی میں یہ حادثہ!"

بیچاری امی اس کے قریب جاکر اسے زبردستی گھسیٹ کر ڈرائنگ روم میں لے گئیں، "بیٹا اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کرو۔" وہ دکھی ہوکر بولیں۔ ان کی آنکھوں میں ماتا کے آنسو تھے اور چہرے پر غم کی جھلک۔ اس نے جیسے سنا ہی نہیں۔ وہ وہاں سے اٹھ کر اپنی لائبریری میں آ بیٹھا اور ایک رسالہ پڑھنے میں مصروف ہو گیا۔ پڑھتے پڑھتے اچانک وہ قہقہے لگانے لگا، "ہمارے

ایک چچا ہیں چھٹن لعل پینسٹھ سال کے ہو گئے، پھر بھی وہ چھٹن لعل ہی کہلاتے ہیں!"

وہ ہنستے ہنستے بے حال ہو گیا۔ اس کی ہنسی کا ہریا دوسرے کمرے میں پہنچا تو امی پھر ہاؤس گاؤن سنبھالتی ہوئی لائبریری میں چلی آئیں۔ "بیٹا کیوں ہنس رہے ہو؟"

"امی۔ وہ۔ وہ۔" وہ پھر قہقہے لگانے لگا۔ اور امی گھبرا کر قرآن کریم کی آیت پڑھ پڑھ کر اس پر دم کرنے لگیں۔ دم کرنے سے بھی اس کے قہقہے نہ رک سکے تو امی دوسرے کمرے میں گئیں اور ڈاکٹر کو فون کر کے الٹے پاؤں اس کے پاس چلی آئیں۔ اس نے امی کو غور سے دیکھا اور سوچا۔ "کیا وقت کے ساتھ ساتھ انسان یوں ہی اپنے حواس کھو دیتا ہے؟"

چند لمحوں بعد ڈاکٹر کمرے میں چلا آیا، "ہلو! سلیم گڈ بوائے!"

اس نے ڈاکٹر کی طرف غور سے دیکھا اور سوچا یہ شخص بھلا کون ہو سکتا ہے، شکل تو کچھ مانوس دکھائی دیتی ہے۔ "میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟ اس نے ڈاکٹر سے پوچھا۔ ڈاکٹر نے بغیر جواب دیے اس کا معائنہ کیا، "آپ بہت زیادہ سوچتے ہیں بہتر ہے شادی کر لیں۔" ڈاکٹر نے اسے مشورہ دیا۔ اس نے اچانک ڈاکٹر کی طرف غور سے دیکھا اور سوچا، "یہ شخص کتنا بے وقوف ہے۔ اسے یہ بھی معلوم نہیں کہ میری شادی ہو چکی ہے اور میں چھ عدد بچوں کا باپ ہوں!"

"میں آپ کو اپنے بچوں سے ملاتا ہوں۔" وہ ڈاکٹر کو شرمندہ کرنے کی غرض سے بک شیلف کی طرف بڑھا، اپنی تصنیف کردہ چھ کتابوں کو ڈاکٹر کی گود میں ڈال کر بولا، "ان سے ملیے یہ میرے بچے ہیں!" ڈاکٹر گھبرا گیا۔

"میں جانتا ہوں آپ مشہور ادیب ہیں۔" پھر ڈاکٹر نے آہستہ سے امی سے کہا، "کیس سیریس ہے اسپتال میں داخل کر دیں۔" اور فیس لے کر چلتا بنا۔ وہ

ڈاکٹر کو دیکھتا رہ گیا، "کیسے بدذوق انسانوں سے پالا پڑا ہے۔" وہ منمنایا اور اپنی کتابوں کی جلدوں پر بڑے پیار سے ہاتھ پھیرنے لگا۔ پھر اس نے ایک ایک کرکے ان کے ورق الٹنے شروع کر دیئے!

پہلی کتاب کا انتساب نینا کے نام تھا، دوسری کتاب اداس لمحوں سے منسوب تھی، تیسری، چوتھی۔ اور یہ نینا کون تھی؟ اس نے ذہن پر زور ڈالتے ہوئے سوچا۔ "نینا!" اسے کچھ یاد آیا نینا اس کی چچازاد بہن تھی۔ جو بہت حسین اور بہت ہی خوش اخلاق تھی۔ اس نے گھبرا کر سوچا، "مگر نینا کہاں کھو گئی۔؟ کیا وہ خود بھی اس کا گھر بھول گیا۔؟" نینا۔ نینا کہاں کھو گئی۔؟ اس کا ذہن پھٹنے لگا اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ امی گھر نہیں ملتا۔ گھر نہ جانے کہاں کھو گیا؟ گھر کیوں نہیں ملتا؟ امی۔" اور روتے روتے وہ بے دم ہو گیا۔

(زندگی کا پہلا ورق) وہ بہاروں کے دن تھے، نینا اس کے ساتھ ساتھ جو تھی۔ ان دنوں رومانس پرور موسیقی اسے بے انتہا اچھی لگتی تھی نینا کو وہ جب بھی دیکھتا تو اسے یوں محسوس ہوتا جیسے نینا شفق کے جھولے پر جھولتی ہوئی اس کے قریب آگئی ہو۔ اسے دیکھ کر ہمیشہ اسے یہ احساس ہوتا جیسے وہ شہزادہ سلیم ہے اور نینا انار کلی! لیکن لیکن۔ انار کلی تو روایت کے مطابق محبت کے جرم میں دیوار تلے چنوا دی گئی تھی۔ تو۔ تو کیا یہ انار کلی کی واپسی تھی۔؟

(زندگی کا دوسرا ورق) وہ اکثر لاہور سے حیدر آباد آتا تو اس کا دل خوشی سے جھوم جھوم اٹھتا۔ راستے بھر وہ نینا کے تصور میں ڈوبا رہتا۔ اس نے نینا کا ایک حسین سا اسکیچ اپنے ذہن میں سجا رکھا تھا اور وہ خاکہ گوشت پوست سے بنی ہوئی نینا سے بھی بے انتہا حسین تھا، نینا ہر لمحہ اس کے ذہن

پرچھائی رہتی (وہ لمحے کتنے جاوداں تھے)؟ حیدرآباد آکر وہ نت نئی شرارتیں
کرتا اور سارے لوگوں کو خوب ہنساتا۔ تمام لوگ اس کی خوش مزاجی کے
قائل تھے۔ نینا اس کی شخصیت سے متاثر تھی۔ نئے نئے پروگرام بنتے، کبھی
کیرم کھیلا جاتا، کبھی سیر سپاٹے ہوتے اور کبھی کسی مضمون پر تنقید، تبصرے کیے جاتے
پھر وہ اداس اداس اپنے گھر لوٹ جاتا۔

کمپیٹیشن کے امتحان میں جب وہ پہلی بار فیل ہوا تو اس کے خواب
اچانک زخمی ہوگئے۔ یہ اس کی زندگی کا سب سے سنہرا چانس تھا اور وہ اس
چانس کو قسمت کے ہاتھوں کھو چکا تھا، کیونکہ عمر کا وہ لمحہ آخری تھا جس کے بل
بوتے لوگ سی۔ ایس۔ پی۔ افسر بن جاتے ہیں۔ اس بات کا دکھ سارے خاندان
کو ہوا اور لوگ اس سے کترانے لگے۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے خاندان کا وہ ذہین لڑکا
اپنے آپ کو افسانوں میں الجھا بیٹھا۔ اور جب وہ حیدرآباد آیا تو نینا کے گھر کے
سارے لوگ اس سے نہ جانے کیوں ڈرے ڈرے سہمے سہمے تھے۔ ایک دن اس
کا تعارف گھر آئے ہوئے مہمانوں سے کرایا گیا، "یہ ہمارے خاندان کا بہت ذہین
لڑکا تھا، لیکن اسے افسانہ نگاری نے تباہ کر دیا۔" اس نے اس لمحہ بہت دکھ
سے اپنی چچی کی طرف دیکھا اور اس لمحہ اس کا دل چاہا وہ یہاں سے فوراً بھاگ
جائے۔ اور اس رات وہ دیوانوں کی طرح ساری رات سڑکوں پر مارا مارا
پھرتا رہا اور صبح کی پہلی گاڑی سے اپنے گھر لوٹ گیا۔ زندگی نے اس سے
رخ موڑ لیا تھا۔ خوشیاں روٹھ گئی تھیں۔ اور وہ جیسے ازل سے تنہا اپنے
ارمانوں کی نعش کو اپنے کاندھوں پر اٹھائے اپنے آپ کو ڈھونڈتا پھر
رہا تھا اور چند دنوں بعد نینا کی شادی کا دعوت نامہ اس کی امی کے نام ملا۔
(زندگی کا تیسرا ورق) نینا کی شادی کا دعوت نامہ دیکھ کر وہ چاہتے

ہوئے بھی نہ رو سکا۔ امّی نے گہری نظروں سے اسے دیکھا۔ لیکن۔

گھر مہمانوں سے بھرا تھا۔ (زندگی کا آخری ورق) نینا اپنے کمرے میں دلہن بنی بیٹھی تھی، بچے شور و غل مچا رہے تھے اور وہ لوگوں کے ساتھ گھر میں شادی کی تیاریوں میں مصروف تھا۔ خاندان والے اسے اس طرح دیکھ رہے تھے جیسے وہ پاگل ہو یا عادی مجرم!

اور جب نینا رخصت ہونے لگی تو اس کا دل چاہا وہ اسے روک لے اور اس سے کہے، "نینا تم مجھے چھوڑ کر نہ جاؤ۔ تم نے مجھ سے وعدہ کیا تھا۔ میں تمھارے بغیر بھلا کس طرح جی سکوں گا۔" مگر۔ مگر نینا چلی گئی۔ (کامیاب ایکٹرس لڑکی) ۔ اور وہ گھر کے دروازے پر دیوانوں کی طرح کھڑا سوچتا رہا۔ سوچتا رہا پھر وہ بے خیالی میں ہنس پڑا (یہ ہنسی کیسی تھی؟) یہ۔ یہ لڑکی جو ابھی ابھی دلہن بن کر گئی ہے۔ وہ کون تھی؟ نینا۔؟ نہیں نہیں۔ وہ نینا نہیں تھی۔ وہ تو کوئی اجنبی لڑکی تھی۔ نینا نے تو عہد و پیمان کیا تھا، عمر بھر کی رفاقت کی قسم کھائی تھی۔ وہ کوئی اجنبی ہی لڑکی تھی۔ میں جسے نہیں جانتا۔!

گھر کے سارے لوگ نینا کی رخصتی پر آنسو بہا رہے تھے، اچانک اس پر امّی کی نظر جا پڑی "سلیم! تم کھڑے کیوں ہو آؤ بیٹھ جاؤ۔"

"ہوں" وہ چونکا۔ پھر اس نے ڈوبتے ہوئے دل سے تمام مہمان لڑکیوں میں نینا کو تلاش کرنا چاہا، لیکن نینا وہاں نہ تھی۔ "تو کیا واقعی نینا مجھے چھوڑ کر چلی گئی؟ وہ گھبرا کر جیسے خود سے بولا، "مجھے۔ مجھے جانا چاہیے۔"

"کہاں جا رہے ہو۔؟" مہمان رشتہ دار خاتون نے اس سے پوچھا۔ "مجھے گھر تلاش کرنا ہے" ۔ یہ کہہ کر وہ گھر سے نکل بھاگا۔ امّی نے اسے روکنا چاہا

لیکن وہ بضد رہا اور ساری رات آوارہ سڑک پر گھومتا رہا اور صبح تک لوگوں نے اسے جانے کہاں کہاں تلاش کیا - آخر کار انہوں نے اسے سڑک پر بے حال گھومتے ہوئے پا ہی لیا - "سلیم! تم کہاں گھوم رہے ہو؟ تمہاری امی تمہاری منتظر ہیں"- ایک نے اس سے کہا -

"میں اپنی تلاش میں سرگرداں ہوں، تم لوگ کون ہو -؟" اس نے ان سے پوچھا -

پھر ان لوگوں نے اسے زبردستی دبوچ لیا اور گھر لے آئے اور اسی دن امی اسے اپنے ساتھ لے کر لاہور چلی گئیں - خاندان بھر میں طرح طرح کی باتیں اس سے منسوب ہو گئیں - اکثر خاندان کے لوگ اس کا ذکر کرتے اور افسوس کرتے - پھر ایک عرصہ گزر گیا - وقت کو بھلا کس نے گرفت کیا ہے؟

ایک دن اسے امی نے بتلایا، "نینا اپنے شوہر اور بچے سمیت آرہی ہے" اس نے اپنے ذہن پر زور ڈالا اور سوچا - "نینا آرہی ہے؟ - مگر یہ کیا مذاق ہے اس کا شوہر اور بچہ بھی؟ تو کیا کوئی اور دوسری لڑکی اس کے گھر آرہی ہے؟ لیکن بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے -؟ -" اور اسی دن جب وہ سڑکوں پر آوارہ گردی کرتے کرتے گھر پہنچا - تو اس کے گھر مہمان موجود تھے - ایک صحتمند لڑکی شوخ ساڑی لپیٹے ایک خوبصورت سے بچے کو گود میں لیے بیٹھی اس کی امی سے اس کے بارے میں باتیں کر رہی تھی - امی اسے دیکھ کر خوش ہو کر بولیں "سلیم بیٹا! دیکھو کون آیا ہے - نینا اور اس کا بچہ اور تمہارے بہنوئی" اس نے ایک لمحہ بیٹھی ہوئی لڑکی کی طرف دیکھا اور پھر غصہ سے بولا "امی! آپ بھی حد کرتی ہیں یہ لڑکی نینا کہاں ہے؟ جیسے میں نینا کو جانتا ہی نہیں؟" - یہ کہہ کر وہ اپنے کمرے میں گھس گیا اور نینا بے ساختہ رو پڑی!

لیکن۔ لیکن وہ برابر سوچے جا رہا تھا۔ یہ لڑکی بھلا نینا کب ہو سکتی ہے؟ نینا تو بہت دبلی پتلی نازک سی خوبصورت لڑکی تھی۔ اس نے پھر پردہ ہٹا کر کمرے میں جھانکا۔

کیا وہ سچ مچ وہی ہے؟، مگر نہیں وہ نینا نہیں، وہ تو کوئی اجنبی لڑکی ہے جسے میں نہیں جانتا اور امّی بھی حد کرتی ہیں۔ اس نے بک شیلف سے کتاب اٹھائی اور پڑھنے لگا۔" خداوند کہتا ہے مجھے دو بار اپنے بندوں پر ہنسی آتی ہے۔ ایک بار اس وقت میں جسے بگاڑنے پر تلا ہوا ہوں اور وہ اپنے آپ کو بنانے کی کوشش میں مصروف ہو، اور دوسری بار اس وقت جب میں جسے بنانا چاہتا ہوں، لیکن وہ اپنے آپ کو تباہ کرنے پر آمادہ ہو۔"

"ایک ایسے جرنلسٹ کا قصہ جو زندگی کی بازی
جیت کر بھی اپنا سب کچھ ھار چکا تھا - پھر
تیس سال بعد حالات اسے وھاں لے گئے جہاں
اس کی اپنی نعش ایک تنہا ویران کمرے میں
جھول رہی تھی - ھاں! وہ اس کی اپنی ھی نعش
تھی -"

اپنی نعش

وہ ایک خزاں رسیدہ شام تھی - پیڑ ننگے ساکت و جامد کھڑے تھے، کبھی کبھی ہوا کا آنچل لہراتا اور سوکھے پتوں میں کھڑکھڑاہٹ پیدا ہو جاتی - زرد سورج شام کے دھندلکے میں تحلیل ہو رہا تھا۔

جب میں ریسٹ ہاؤس پہنچا تو وہاں کا بوڑھا ملازم سوکھے پیڑ تلے حقہ گڑگڑا رہا تھا - مجھے دیکھتے ہی وہ کپڑے جھاڑ کر کھڑا ہو گیا اور کھانستا ہوا بولا، "میں آپ ہی کا منتظر تھا - خان بہادر صاحب کا خط مجھے مل گیا تھا۔" یہ کہہ کر اس نے میرا سوٹ کیس اپنے ہاتھوں میں تھام لیا اور مجھے نہانے کی ہدایت دے کر خود میرے لیے چائے بنانے چلا گیا۔

ریسٹ ہاؤس میں ہر چیز قرینے سے سجی ہوئی تھی اور خان بہادر صاحب کی شخصیت کی طرح شائستہ اور شگفتہ تھی، خان بہادر صاحب اس گاؤں کے زمیندار تھے اور یہ ریسٹ ہاؤس ان کے باپ دادا کی ملکیت تھا۔

ان دنوں میں شہر کے ہنگاموں سے بے حد اکتایا ہوا تھا اور خان بہادر صاحب کے مشورے پر کچھ دن کے لیے یہاں سکون کی تلاش میں چلا آیا تھا - اور یہاں واقعی سکون تھا - ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے بھاگتی دوڑتی زندگی اچانک رک گئی ہو اور وقت کی باگیں کسی نے اچانک کھینچ لی ہوں -

جب میں نہا دھو کر کرسی پر سکون سے بیٹھا سوچ رہا تھا، اچانک بوڑھا

ملازم چائے اور پھل لیے چلا آیا۔ اس کی آمد مجھے ناگوار گزری، کیونکہ میری سوچ کا دھاگہ ٹوٹ گیا۔ سوچنا مجھے بے انتہا پسند ہے، تنہائی اور سوچ میں ایک گہرا رشتہ ہے اور تنہا بیٹھ کر سوچنا، حسین خواب دیکھنا، میں زندگی کا سب سے بڑا عیش تصور کرتا ہوں پتہ نہیں اس لمحہ میں جانے کیا سوچ رہا تھا، یہ بھی ایک دلچسپ بات ہے کہ مجھے خود بھی پتہ نہیں کہ میں کیا سوچتا ہوں۔ بہر حال بوڑھے ملازم کی طرف دیکھ کر میں مسکرایا، دراصل میں اسے یہ تاثر دینا چاہتا تھا کہ اس کی آمد سے ناراض نہیں بلکہ خوش ہوا ہوں۔ یہ بھی شہری زندگی کا دیا ہوا اصول ہے۔ دل رونا چاہے مگر کھو کھلے قہقہے لگاؤ، کسی سے نفرت کرتے ہو۔ اور اگر وہ اچانک سامنے آجائے تو زبردستی اپنے چہرے پر مسکراہٹ لاکر اس کا استقبال کرو اور یہ ظاہر کرو کہ اس سے مل کر واقعی بہت خوشی ہوئی۔ یہ شاید اس صدی کا سب سے بڑا المیہ ہے کہ شہروں نے ہم سے ہماری مسکراہٹ، ہماری صحت، ہماری محبت اور ہمارے تمام رشتوں اور خلوص تک کو ہم سے جدا کر دیا ہے۔ کبھی کبھی میرا دل چاہتا ہے کہ تمام شہروں کو آگ لگا دوں اور پھر ایک بار ہم سب اپنے روایتی انداز سے جنگلوں میں جا بسیں اور محبت بھری پر سکون زندگی گزاریں اور قدرتی حسین نظاروں سے محظوظ ہوں جہاں ہر طرف محبت ہی محبت ہو، کیونکہ نفرت انسان کی سب سے بڑی کمینگی، سب سے بڑی کمزوری اور سب سے اوچھا ہتھیار ہے۔

سوچتے سوچتے میں نے چائے پی، تھوڑے سے پھل کھائے اور سگریٹ جلا کر بوڑھے ملازم سے پوچھا "کیا تم یہاں تنہا ہی رہتے ہو؟" اس نے میری جانب اس طرح دیکھا جیسے میں نے اس کی کسی دکھتی ہوئی رگ پر ہاتھ رکھ دیا

ہو۔ وہ بڑی معصومیت سے بولا، "ہاں بابو جی! مگر آپ فکر نہ کریں یہاں کوئی خطرہ نہیں۔"

خطرے والی بات پر میرا دل چاہا کہ میں زور سے ہنسوں مگر میں خاموش ہی رہا اور سوچنے لگا کہ اس سے کہوں "بابا! دنیا کا ہر فرد تنہا ہے یہاں کوئی کسی کا نہیں۔ ہم محض سائے ہیں جو آرزوؤں اور خوابوں کی جستجو میں اپنی نعش کو اپنے کاندھوں پر اٹھائے اپنے آپ کو ڈھونڈتے پھر رہے ہیں اور پھر ایک دن اپنی آرزوؤں، اپنی تمناؤں کے ساتھ لپٹ کر وقت کے صحرا میں بکھر جاتے ہیں۔"

مجھے یوں سوچتا دیکھ کر وہ گھبرا کر بولا، "آپ تھکے ہوئے ہیں۔ آرام کریں۔ میں آپ کے لیے کھانے کا انتظام کرتا ہوں۔"

میں حسن پرست ہوں۔ پھولتی ہوئی شفق، چودھویں رات کا چاند اور پہاڑیوں پر گرتی ہوئی برف میری سب سے بڑی کمزوری ہے۔ رات گہری ہو چلی تھی، خزاں رسیدہ چاند اودھے آسمان پر ابھر آیا تھا اور ہواؤں میں خنکی کا نشہ تھا، میں بے تاب ہو کر مشرقی کھڑکی پر جھک گیا۔ ہر طرف سکوت تھا۔ ٹھہراؤ تھا اور اداس چاندنی ایک نیا تاثر بیدار کر رہی تھی۔ اس پر اسرار سے ماحول میں کھو سا گیا۔ مجھے وقت کا احساس اس وقت ہوا جب بوڑھے ملازم نے مجھے کھانے کے لیے آواز دی۔

آتش دان پر موم شمع روشن تھی اور اس کی دھیمی دھیمی روشنی میں بوڑھا ملازم بڑا پُر اسرار نظر آ رہا تھا میں جب تک کھانا کھاتا رہا وہ خاموشی سے بیٹھا رہا اور جب میں کھانا کھا چکا تو وہ اسی خاموشی سے برتن اٹھا کر چلا گیا۔

سفر کی تھکن سے میں نڈھال ہو کر بستر پر گر پڑا اور سوچتے سوچتے سو گیا۔

صبح جب میری آنکھ کھلی تو سورج کافی بلندی پر چڑھ آیا تھا اور بوڑھا ملازم میرے جاگنے کا منتظر تھا۔ ضروریات سے فارغ ہو کر میں نے ناشتہ کیا اور تفریح کا پروگرام مرتب کرنے لگا۔

"رات کو تو آپ سکون سے سوئے بابو صاحب!" بوڑھے ملازم نے اچانک مجھ سے سوال کیا۔

"ہاں! اچھی طرح، شاید بہت تھکا ہوا تھا۔ مجھے تو معلوم ہی نہ ہوا کہ میں کب سویا۔"

"ہوں"! بوڑھے ملازم نے ایک سرد آہ بھری جیسے وہ کچھ کہنا چاہتے ہوئے بھی کچھ کہہ نہ سکتا ہو۔ میں نے اس سے پوچھا، "تم شاید کچھ کہنا چاہتے ہو۔؟"

"جانے دیجئے بابو صاحب! آپ شاید مذاق سمجھیں گے کیا خاں صاحب نے آپ کو کچھ نہیں بتایا ہے"۔

اور اس لمحے مجھے یاد آیا، خان بہادر صاحب نے چلتے وقت مجھ سے ہنسی ہنسی میں کہا تھا کہ ریسٹ ہاؤس میں کسی لڑکی کی آوارہ روح رات کی تنہائیوں میں بھٹکتی پھرتی ہے۔ ذرا احتیاط کرنا یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گئے پھر زور سے ہنس دیے جیسے مذاق کر رہے ہوں یا پھر اپنے آپ کو ترقی یافتہ شہری ثابت کرنا چاہتے ہوں اور یہ بات کسی حد تک درست ہی تھی۔ اس ایٹمی دور میں بھٹکتی روح کا تصور ہی مذاق معلوم دیتا ہے۔

بوڑھے ملازم کی بات سن کر میرے دل میں شدید اشتیاق پیدا ہوا کہ اصل معمے کو سمجھ لوں، اس لیے میں نے اس سے کہا، "ہاں! خان بہادر صاحب کسی روح کا ذکر کر رہے تھے۔ کاش میں بھی اسے دیکھ سکتا۔!"

"کمال ہے بابو صاحب! شاید آپ پہلے شخص ہیں جسے اس روح نے پریشان نہیں کیا۔"

"اصل بات کیا ہے؟" میرا تجسّس اور بڑھ گیا۔

"اصل بات تو مجھے بھی نہیں معلوم، مگر کہتے ہیں کہ آج سے تیس سال پہلے یہاں خان بہادر صاحب کے رشتے کا کوئی لڑکا اپنی محبوبہ کو شہر سے لے آیا تھا اور پھر دونوں نے اندر والے کمرے میں اپنے آپ کو بند کر کے خودکشی کر لی۔

چھ، سات ماہ تک تو کسی کو کچھ پتا ہی نہ چل سکا۔ لوگ سمجھے کہ دونوں نے دور کہیں گھر بسا لیا۔ مگر جب کوئی اس ریسٹ ہاؤس میں سات آٹھ ماہ بعد آیا۔ تو رات کو اچانک اس نے سسکیوں کی آواز سنی اور پھر اندھیرے میں اسے دو سائے لہراتے ہوئے نظر آئے۔ بے چارہ بے ہوش ہو گیا اور صدمہ سے اس کا ذہنی توازن بگڑ گیا۔ لوگوں کو جب پتہ چلا تو انہوں نے ریسٹ ہاؤس کو دیکھا، مگر اندرونی کمرہ اندر سے بند تھا۔ ڈر کی وجہ سے لوگوں میں ہمت نہ ہوئی کہ وہ کواڑوں کو کسی طرح کھول کر اندر دیکھ سکیں کہ اندر کیا ہے؟ اور آج تک یہ کمرہ یوں ہی بند پڑا ہے۔ جب کوئی مہمان یہاں آ کر ٹھہرتا ہے تو رات کو روحیں طرح طرح سے اسے پریشان کرتی ہیں۔"

مجھے پتہ نہیں، بوڑھا کہانی سنا کر کب چلا گیا، مگر جانے کیوں مجھے یہ احساس ہوا کہ اس واقعے سے تو میں پہلے ہی سے واقف ہوں اور میں ان تمام رازوں کو بخوبی جانتا ہوں جو اندر کمرے میں دفن ہیں۔ اچانک اندرونی کمرے کا جائزہ لینے کا تجسّس جاگ اٹھا اور میں دیوانہ وار کمرے کی جانب بڑھا۔ اچانک میری نگاہیں آتشدان پر رکھی ہوئی مومی شمع سے جا ٹکرائیں۔ مومی شمع کو تو رات بھر میں

جل کر پگھل جانا تھا مگر وہ تھوڑی سی جل کر بجھ گئی تھی۔ میں نے ذہن پر زور ڈالا تو مجھے یاد آیا کہ جب میں سونے کے لیے بستر پر لیٹا تھا تو موم بتی تقریباً اتنی ہی جل چکی تھی۔ تو۔ تو کیا میرے سوتے ہی کسی نے اسے بجھا دیا تھا۔؟

بارش کی سیل اور ایک طویل مدت تک بند رہنے کی وجہ سے کمرے کے کواڑ بالکل جامد ہو چکے تھے اور زور لگانے پر یوں محسوس ہوتا تھا جیسے کسی نے آہنی دیوار بنا کر کھڑی کر دی ہے۔ اچانک میرے ذہن میں خیال آیا کہ پہلے باہر کے تمام دروازے بند کر دوں تاکہ میرے کام میں کوئی مخل نہ ہو سکے، چنانچہ میں نے تمام دروازے اندر سے بند کر دیے اور پھر اپنی پوری طاقت کواڑوں کو کھولنے میں صرف کر دی، مگر کواڑ ہلے تک نہیں۔

اس وقت میرے اندر اتنی طاقت جانے کہاں سے آ گئی تھی یا پھر کوئی غیبی طاقت مجھے اس کام کو انجام دینے کے لیے مدد دے رہی تھی۔ میں نے اپنے جسم کو کواڑوں سے ٹکرانا شروع کر دیا۔ اچانک کواڑ چرمرائے اور اس کی چولیں ڈھیلی ہو کر گر پڑیں ایک عجیب قسم کی خوشبو میری ناک سے ٹکرائی، میں نے اپنا ہاتھ ناک پر رکھ لیا۔ اور جب آنکھیں تاریکی میں دیکھنے کی عادی ہو گئیں تو میں نے دیکھا، چھت کے کنڈے سے ایک رسی بندھی ہوئی تھی اور لٹکی ہوئی رسی کے پھندے میں ایک انسانی ہڈیوں کا ڈھانچہ جھول رہا تھا۔ فرش پر ایک اسٹول اوندھے منھ گرا پڑا تھا۔ اگر کوئی دوسرا شخص میری جگہ ہوتا تو یقیناً خوف سے اس کی چیخ نکل جاتی اور ممکن تھا کہ وہ اپنا ذہنی توازن برقرار نہ رکھ سکتا۔ مگر مجھے یہ ماحول کچھ جانا پہچانا سا لگا۔ میں نے زمین پر پڑے ہوئے اسٹول کو اٹھایا اور اس پر اطمینان سے بیٹھ گیا اور رسی میں جھولتی نعش کو غور سے دیکھنے لگا۔ یکایک میں بھولے بھٹکے ان جزیروں میں جا پہنچا، جہاں ہر طرف پھول ہی پھول کھلے

ہوئے تھے۔ تمام واقعات سلسلہ وار مجھے یاد آنے لگے۔

"ان دنوں میں بہت ہی خوش تھا، ہر طرف بہار ہی بہار تھی اور میرے چاروں اور حسین خوابوں کا جال بچھا ہوا تھا۔ اور نینا کتنی خوبصورت تھی۔ اس کی آنکھیں پُرسکون جھیل کی مانند کشادہ اور گہری تھیں۔ اور اس کا رنگ کھلتے ہوئے گلاب کی طرح گلابی تھا۔ وہ مجھ سے ملتی تو مجھے یوں احساس ہوتا جیسے وہ شفق کے جھولے پر جھولتی ہوئی میرے قریب آگئی ہو۔ ہم گھنٹوں پائیں باغ کے تنہا گوشے میں گلاب کی کیاریوں میں بیٹھے کیٹس اور شیلے کی رومانٹک نظمیں گنگنایا کرتے، مگر برا ہو سماج کا، مجھے احساس تھا کہ وہ مجھے مل کر بھی نہیں مل سکتی تھی، کیونکہ میں اخبار کا ایک معمولی رپورٹر تھا اور وہ ایک امیر باپ کی اکلوتی بیٹی جو عیش و عشرت میں پل کر جوان ہوئی تھی، بھلا آسمان اور زمین کا کیا مقابلہ؟

اکثر ہم مستقبل کے بارے میں سوچتے سوچتے گم ہو جاتے۔ وہ مجھے سہارا دیتی، میری ہمت بڑھاتی اور نئے حوصلے جگاتی اور میں نیا عزم، نیا ولولہ لے کر سوچتا ہوا اپنے آپ کو دھوکا دیتا اپنے گھر چلا جاتا۔ زندگی گزارنے کے لیے اکثر ہمیں اپنے آپ کو طرح طرح سے دھوکے بھی دینے پڑتے ہیں اور اپنے آپ کو رنج کر منانا بھی پڑتا ہے۔ ان دنوں یہی حال میرا تھا۔ لیکن کب تک؟ تلخیوں اور محرومیوں کا آخر مداوا بھی کیا ہے؟ اس رات میں سگریٹ پر سگریٹ پیتا رہا اور سوچتے سوچتے آخری فیصلہ کرنے نینا کے گھر چلا گیا۔

ان دنوں نینا کے ممی اور ڈیڈی پہاڑی مقام پر گرمیاں گزارنے گئے ہوئے تھے اور نینا میرے لیے اور کچھ امتحان دینے کے لیے گھر پر رہ گئی تھی۔ جب میں اس کے خوبصورت بنگلے پر پہنچا تو وہ برآمدے میں بیٹھی ٹالسٹائی کا ناول پڑھ رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ مسکرائی، مگر میں سنجیدہ ہی رہا اور کافی دیر

تک بیٹھا خلا میں گھورتا رہا۔ آخر سکوت اس نے ہی توڑا۔ "آج تم پر شاید پھر دیوانگی کا دورہ پڑا ہے۔" میں اور بھی اداس ہو گیا۔

دراصل وہ میری تمام کمزوریوں سے واقف تھی اور اس کی یہ بات کسی حد تک درست تھی۔ کبھی کبھی مجھے مایوسیوں کے شدید دورے پڑتے اور میں اپنے آپ کو کمرے میں بند کر لیا کرتا۔ آخر پھر نئی امید، نئے جذبے کے سہارے پھر اپنے آپ کو دنیا کے جھمیلوں میں الجھا دیتا۔

"تم کچھ بولو گے بھی یا یوں ہی بیٹھے بور کرتے رہو گے؟" اس نے مجھے چھیڑا۔

اور اس لمحے میں اور بھی جذباتی ہو گیا۔ میں نے کہا۔ "نینا آج میں آخری فیصلہ کرنے آیا ہوں تمہیں اگر واقعی مجھ سے محبت ہے تو ...."

اس نے بات منہ سے چھین لی۔ "تم آخر چاہتے کیا ہو؟ کیا میں ممی اور ڈیڈی کو چھوڑ کر ان کی عزت کو روندتی ہوئی تمہارے ساتھ بھاگ چلوں؟"

"ہاں! اگر تمہیں واقعی مجھ سے محبت ہے اور جیسا کہ تم اکثر اظہار بھی کرتی رہی ہو، تو تمہیں میرے ساتھ چلنا ہی ہوگا۔"

"کیا۔ کیا تم۔؟" اس کے چہرے کا رنگ پھیکا پڑ گیا اور ہونٹ کپکپانے لگے اور وہ اپنی چپل سے زمین کریدنے لگی۔

"وقت بہت کم ہے۔ مجھے جواب دو نینا! کیا تم میرے ساتھ چلنے کو تیار ہو؟" میں نے اس سے پھر کہا۔ "مگر ہم جائیں گے کہاں؟" اس نے یکایک سوال کیا۔

میری کچھ ڈھارس بندھی، حوصلہ ملا اور میں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

یہاں سے سو میل دور میرے ماموں کا ریسٹ ہاؤس ہے۔ ماموں ان دنوں لندن گئے ہوئے ہیں اور چابیاں امی کے پاس ہیں۔ کچھ دن ہم ریسٹ ہاؤس میں ٹھہریں گے، پھر کسی دوسرے شہر میں جا بسیں گے۔"

"مگر۔" وہ کچھ کہنا چاہتی تھی، میں نے پھر اس سے کہا، "پگلی تم بیوقوف ہو۔ تمہیں معلوم نہیں تمہاری ممی اور تمہارے ڈیڈی تم سے کتنی محبت کرتے ہیں اور تم ان کی اکلوتی بیٹی ہو۔ یہ ٹھیک ہے کہ وہ لوگ کچھ دنوں تم سے ضرور ناراض رہیں گے، مگر تم دیکھنا چند دنوں بعد وہ تمہیں منانے خود تمہارے پاس آئیں گے۔"

بات اس کی سمجھ میں آگئی۔ چنانچہ جلدی جلدی وہ تیار ہوئی اور آیا سے فلم کا بہانہ کر کے میرے ساتھ چل دی۔ میں بہت خوش تھا اور کامیابی کے نشے میں میرے قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ جیب میں نئے مہینے کی تنخواہ کے علاوہ پانچ سو روپے اور بھی تھے۔

راستے بھر نینا اداس اداس، کھوئی کھوئی سی رہی۔ شاید اسے اپنی ممی اور ڈیڈی کی یاد ستا رہی تھی۔ آخر چند گھنٹوں کی مسافت کے بعد منزل مقصود آگئی۔ میں نے ریسٹ ہاؤس کھولا، منہ ہاتھ دھویا اور نینا کو چھوڑ کر کھانے کا انتظام کرنے باہر نکل گیا۔

ہم مشرقی لوگ بھی کس قدر جذباتی ہوتے ہیں جذبات کے ریلے میں بہہ کر بڑے سے بڑا فیصلہ کر گزرتے ہیں چاہے بعد میں ہمیں پچھتانا ہی کیوں نہ پڑے۔ میرا ضمیر بھی مجھے ملامت کر رہا تھا اور نینا بھی کھوئی کھوئی سی تھی، لیکن جو ہونا تھا وہ ہو چکا تھا۔ اور جب میں کھانے پینے کا سامان لے کر واپس لوٹا تو نینا بے تحاشا رو رہی تھی اور صدمے سے اس کا برا حال تھا۔ میں نے اسے پانی پلایا،

دلاسہ دیا، مگر وہ انجانے خوف سے بے چین تھی۔ کھانا یوں ہی رکھا رہا اور ہم دونوں کافی دیر تک یوں ہی خلاء میں گھورتے رہے۔ آخر سکوت میں نے توڑا۔ وقت اب بھی زیادہ نہیں گزرا ہے میرا خیال ہے تم واپس گھر چلی جاؤ، تمہیں میں اسٹیشن چھوڑ آتا ہوں۔ مجھے اعتراف ہے کہ میں خود غرض ہوں اور میں نے تمہیں بہکایا اور اب میں خود بھی اپنی غلطی پر نادم ہوں، محبت کا مطلب یہ تو نہیں کہ دوسروں کے جذبات سے کھیلا جائے اور آخر یہ بھی کیا ضروری ہے کہ ہم دونوں کی شادی بھی ہو جائے، یہ کہہ کر میں خلاء میں گھورنے لگا۔ دراصل میں نینا کے جواب کا منتظر تھا۔

"سچ! تم۔ تم کتنے اچھے ہو علی رضا! مجھے تم سے محبت ہے اور ہمیشہ رہے گی، کیوں نا ممی اور ڈیڈی کو اپنی پسند سے آگاہ کر دوں اور ضد کر کے یہ بات منوالوں، یوں ہی بہتر ہے۔ تم بے فکر رہو۔ چلو واپس چلتے ہیں۔"

شام کے سات بج چکے تھے اور ایکسپریس ٹرین اسٹیشن چھوڑ چکی تھی میں خاموشی سے چلتی ٹرین سے کود پڑا اور نینا واپس چلی گئی۔ جب میں ریسٹ ہاؤس واپس پہنچا تو شام کے دھندلکے گہرے ہو چکے تھے۔ میں ایسا جواری تھا جو جیت کر بھی ہار جاتا ہے۔ یہ میری زندگی کی سب سے بڑی فتح اور سب سے بڑی شکست تھی، سب سے بڑی خوشی اور عظیم المیہ!

اس رات میں تنہا بیٹھا سگریٹ پیتا رہا اور سوچتا رہا، پھر میں فیصلہ کن انداز میں اٹھا اور دوسرے کمرے میں جانے کیا ڈھونڈنے لگا۔ اندرونی کمرے کے کونے میں پڑی ہوئی رسی پر میری نگاہیں جم گئیں جیسے میں اس کا متلاشی تھا، رسی کو میں نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اٹھایا چھت کی طرف گھور کر دیکھا اور دوسرے لمحہ رسی کا پھندا بنا کر چھت سے لگے ہوئے مضبوط کنڈے میں باندھ کر اطمینان سے اسٹول لا کر اس پر کھڑا ہوا ہی تھا کہ اچانک مجھے خیال آیا

کہ کمرے کو اندر سے مقفل تو کیا ہی نہیں، چنانچہ اسٹول سے اتر کر کمرے کو پوری طرح سے بند کر لینے کے بعد اسٹول پر کھڑے ہو کر جھولتی ہوئی رسی کو اپنے گلے میں ڈال کر اسٹول کو لات مار کر گرا دیا - اور - اور پھر ———

دوپہر ڈھل رہی ہے، شاید بوڑھا ملازم کمرے کو کھلا دیکھ کر خوف زدہ ہو کر بھاگ چکا ہے - میں اپنی نعش کے قریب بیٹھا ماضی کی راکھ کرید رہا ہوں۔ یہ جھولتی ہوئی نعش میری اپنی نعش ہے - میں سوچتا ہوں کہ مجھے رات تک یہیں بیٹھے ہوئے ینیتا کی روح کا انتظار کرنا چاہیئے یا واپس جا کر خان بہادر صاحب کو اپنی دلچسپ کہانی سنانی چاہیئے مگر - کیا وہ یقین کر سکیں گے - ؟

———

"ـــــ بعض زخم نہ دکھائی دیتے ہوئے بھی کتنے گہرے اور کتنے گھنے ہوتے ہیں - ایسے ہی زخم خوردہ قلمکار کی کہانی جو گناہ کی دلدل میں پھنستا چلا گیا ـــــ"

پہلا گناہ
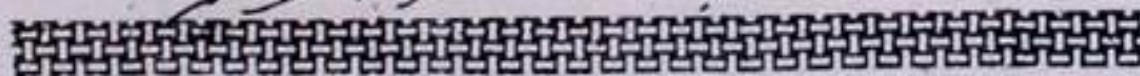
یہ کیسی عجیب بات تھی کہ وہ ایک عورت کے دیئے ہوئے زخم پر دوسری عورت سے مرہم کا پھایا رکھنے کی توقع کر رہا تھا (بعض زخم نہ دکھائی دیتے ہوئے بھی کتنے گہرے اور کتنے گھنے ہوتے ہیں۔)

چلتے چلتے اس کے ذہن میں نینا کی تصویر ابھری، اونچی سوسائٹی کی الہڑ سی کالج گرل جو فلم دیکھ دیکھ کر پروان چڑھی تھی اور جو فطری طور پر رومان پسند تھی، چودھویں رات کا چاند سمندر کے سینے پر مچلتی ہوئی کشتیاں اور کسی بڑے ہوٹل کے ٹیرس پر بچھی ہوئی کرسیوں اور کرسیوں کے اوپر لگی ہوئی رنگین چھتریوں کے تلے بیٹھ کر رومانس پرور موسیقی کی دھنوں میں گم ہو کر اسے کافی سپ کرنا بے انتہا پسند تھا۔ (اور یہ سب کتنا رومانٹک تھا)

لیکن واسطی کی محبت سطحی نہ تھی، اس نے نینا کو محبوبہ بنا کر نہیں چاہا تھا، بلکہ اس نے نینا کو ہمیشہ اپنی ہونے والی بیوی کے روپ میں دیکھا تھا جس سے ایک شاندار گھر کی بنیادیں پڑتی ہیں، اور اس کے ذہن میں ایک بڑے پیارے سے گھر کا نقشہ بسا ہوا تھا۔ جہاں نینا تھی، اس کے بچے تھے اور وہ خود تھا اور اس کے چاروں طرف خوشیاں ہی خوشیاں بکھری پڑی تھیں۔

اور اس کا یہ اعتماد کتنا پختہ تھا کہ نینا اس کی ہے صرف اس کی (بعض اعتماد بے انتہا پختہ ہوتے ہوئے بھی جانے کیوں آن کی آن میں لمحوں کی گرفت سے پھسل پھسل جاتے ہیں؟)

اس کا جرنلزم کا کیریئر کتنا شاندار تھا دکیا کیا جائے ایسے کیریر کا جو نام کے سوائے گاڑی اور بنگلہ نہ دے سکے) اور نینا کو بھی وہ اس اخبار کی طرح چاہتا تھا جس نے اسے عزت بخشی تھی اور نام دیا تھا اور جس سے مستقبل میں اسکی جانے کتنی امیدیں وابستہ تھیں۔ دبعض لوگ عورت کو شام کا اخبار سمجھ کر پڑھتے ہیں، کیا ایسے ہی لوگ فائدے میں رہتے ہیں؟)
"نینا!" کتنا پیارا سا نام ہے۔ نینا! دکاش تم نینا ہوتیں، خود غرض نہ ہوتیں) ۔ جب پانچ سال کی سخت جدوجہد کے بعد بھی وہ اس قابل نہ ہو سکا کہ کم از کم ایک سیکنڈ ہینڈ کار اور سیکنڈ ہینڈ بنگلہ خرید سکے تو اچانک نینا اس سے دور ہونے لگی ۔ ایسے مرد میں بھلا کیا کشش ہو سکتی ہے جس کی جیبیں خالی ہوں ۔ پہلے اس نے اس کے جرنلزم کے کیریر کا مذاق اڑایا اور پھر وہ اسے بالکل ناکارہ سمجھ کر اس سے دور ہونے لگی، بالکل اس طرح جیسے عرشہ سے کوئی جہاز لنگر اٹھا کر آہستہ آہستہ سمندر کے سینے کی طرف بڑھنے لگتا ہو ۔ اور جب اس نے محسوس کیا کہ نینا اس کے جتنی قریب تھی اتنی ہی دور جانا چاہتی ہے تو وہ لرز لرز گیا اور ایک دن اس نے نینا سے کہا "نینا! تم مجھے کس بات کی اتنی بڑی سزا دے رہی ہو۔؟"
"میں آپ کو کیوں سزا دینے لگی؟"
" انجان بننے کی کوشش نہ کرو نینا! پہلے تم نے مجھے حسین خواب دکھائے اور اب ان خوابوں کو خود ہی زخمی کرنے پر کیوں تلی ہوئی ہو؟"
" آپ کو سخت قسم کی غلط فہمی ہوئی ہے واسطی بھائی۔ میں نے آپ کو کوئی خواب نہیں دکھایا۔" داور اس لمحہ اس کا دل چاہا کہ وہ نینا کے منہ پر طمانچہ مار کر پوچھے کہ وہ خواب نہیں تھے تو پھر کیا تھا۔؟)

پھر وہ بڑے بھولپن سے بولی، "ہاں! اگر آپ کا کیرئر اچھا ہوتا تو میں ضرور آپ کے بارے میں سوچتی۔"

(کیرئیر، کیرئیر! اس کا دل چاہا کہ وہ اپنا سر پھوڑ لے اور پھوٹ پھوٹ کر روئے۔)

اس نے سب کچھ اس طرح سنا جیسے کچھ سنا ہی نہ ہو۔ اور ان لمحوں وہ اس طرح کھڑا رہا۔ جیسے وہ کھڑا نہ ہو۔ اچانک باہر سے کار کے ہارن کی آواز آئی۔ ہارن کی آواز پر نینا بچوں کی طرح اٹھلاتی ہوئی گیٹ تک گئی، پھر اونچی آواز میں بولی، "ممی! میں پکچر جا رہی ہوں۔"

ممی نے اس کی آواز سنی یا نہیں البتہ نینا کی آواز اس تک ضرور پہنچ گئی۔ اور اس لمحے اس نے نہ چاہتے ہوئے بھی کھڑکی سے پردہ ہٹا کر جھانکا۔ سرخ رنگ کی سوکس ہنڈا میں ایک صحتمند نوجوان بیٹھا نینا کو تک رہا تھا اور نینا اس کے برابر والی سیٹ پر بیٹھی آئینہ میں اپنے ہونٹوں پر پنک شیڈ کی لپ اسٹک پھیر رہی تھیں۔ اور دوسرے لمحہ ایک جھٹکے کے ساتھ گاڑی اس کی آنکھوں سے اوجھل ہوگئی۔ کھڑکی کا پردہ خود بخود اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ اور وہ کافی دیر تک یوں ہی خلاء میں تکتا رہا۔

نینا کی ممّی نے آکر اسے بٹھایا پھر انہوں نے مسکرا کر اسے کافی بنا کر دی۔ ہائے ممّی! تم بھی کتنی ظالم ہو، میں مر گیا ہوں اور تم مسکرا کر کافی پیش کر رہی ہو۔)

وہ نہ چاہتے ہوئے بھی صوفے پر ڈھیلا ہو کر گر پڑا۔ ممّی نے چلتے چلتے ایک وار اور کیا، "بیگم امجد اپنے لڑکے کا پیغام لے کر کل آرہی ہیں کرنل صاحب کے چھ بنگلے ہیں اور تین مل۔ اور بھئی وہ لوگ خاندانی رئیس ہیں، کل

تمہیں تو کچھ کام نہ ہوگا اس موقع پر تم بھی موجود ہو تو اچھا ہو۔"

(مکار بڑھیا! تم کتنی شریر اور انجان بن رہی ہو۔ کاش میں تمہارا گلا دبا سکتا۔)

"کرنل امجد علی کا لڑکا۔ جنید!" وہ نہ چاہتے ہوئے بھی کہہ گیا، خالہ امی! امجد صاحب تو بڑے اچھے انسان ہیں مگر جنید انتہائی شرابی اور جواری قسم کا لڑکا ہے۔"

"جس کو خدا پیسہ دیتا ہے بیٹا! وہ سب کچھ کرتا ہے۔ اور شادی کے بعد سب ٹھیک ہو جاتے ہیں، ہاں! نینا بھی تو اسے پسند کرتی ہے۔" (غریب کچھ نہ کرتے ہوئے بھی عیاش کہلاتا ہے اور امیر سب کچھ کرتے ہوئے بھی شریف کہلاتا ہے، اور کیا نئی نسل کی سب لڑکیاں شرافت سے زیادہ دولت پر جان دیتی ہیں؟) "آپ کہیں تو انگیجمنٹ کی نیوز اخبار میں لگا دوں۔؟

(اور اس لمحے ممی دل ہی دل میں بولیں، "بڑے سیانے ہو بیٹا کہیں خبر ہی خبر میں نینا کی تشہیر نہ کر ڈالنا۔")

"ابھی اس کی ضرورت نہیں، شادی کے موقع پر تو یہ تمہارا فرض ہوگا!"

(نینا کی تصویر کے ساتھ اپنی نعش کی تصویر بھی چھاپنا۔)

اور کچھ دنوں بعد نینا اس کی ہوتی ہوئی بھی کسی اور کی ہوگئی۔ اور، آج کے اخبار میں نینا اور اس کے شوہر کی تصویر شائع ہوئی تھی۔ نینا دلہن کے روپ میں اس طرح اپنے شوہر کے ساتھ بیٹھی تھی۔ جیسے اس سے پہلے اس نے کسی مرد کو دیکھا تک نہ تھا۔

(اف یہ لڑکیاں کتنی کامیاب ایکٹرس ہوتی ہیں۔)

اس نے تصویر کو ایک بار پھر دیکھا اور اس کے زخم یکایک ہرے ہوگئے۔

اور اب وہ میکانوی انداز میں اپنے وجود کو ایک عورت کے وجود میں جذب کر دینا چاہتا تھا۔ شاید اس طرح شکست کی آواز کچھ دیر کے لیے تھم جائے لیکن کیا عورت کے دیے ہوئے زخموں پر دوسری عورت مرہم کا پھایا رکھ سکتی ہے؟

(یہ آوازیں کہاں سے اٹھ رہی ہیں۔؟)

اور اب وہ اس بازار میں جا پہنچا تھا جہاں عورت، عورت نہیں رہتی، بلکہ محض گوشت کا لوتھڑا بن جاتی ہے۔ (لیکن وہاں عورتیں، عورتیں ہی تھیں اور پائلیوں کی جھنکاریں — اور مرد جو صرف ایک گاہک ہے۔)

انتقام کی آگ اور جنسی بھوک بہت تیز دھک رہی تھی، پھر بھی عورت کی پرکھ ابھی باقی تھی۔ اس کے ہاتھ گرمی کے دنوں میں بھی شل ہو گئے اور ذہن مفلوج سا، چال لشہ آور، چار بار وہ دروازے پر کھڑی لڑکی کے گرد منڈلایا۔ اور چوتھی بار کمرے میں گھس کر ہانپنے لگا۔ یہ اس کا پہلا گناہ تھا۔ اور زندگی کی پہلی لغزش (پہلے پہل شاید یوں ہی ہوتا ہے)

"تمہارا نام کیا ہے؟" اپنے سانس پر قابو پاتے ہوئے اس نے لڑکی سے پوچھا۔ "جمیلہ!" لڑکی منمنائی۔

"جمیلہ!" یکایک اخبار کا رپورٹر اس کے اندر جاگ اٹھا۔

(ایک یہ جمیلہ ہے جو جنس کا کاروبار کرتی ہے اور ایک وہ جمیلہ تھی جس نے الجزائر میں ایک مسلمان ہیروئن کا رول ادا کیا تھا۔)

(یہ دنیا ہے پیارے! اور یہاں پر بے انتہا لوگ ایک ہی نام سے پکارے جاتے ہیں، لیکن ان کے کردار ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہوتے ہیں۔) اور جمیلہ کا معصوم سا چہرہ دیکھ کر نہ جانے کیوں اس کا دل چاہا

کہ وہ نینا اور اپنے بارے میں سب کچھ اسے بتا دے۔ لیکن وہ سنبھل گیا اور بولا، "جمیلہ! تم کتنی اچھی ہو۔ کیا۔ کیا تم مجھ سے شادی نہیں کر سکتیں؟" جمیلہ نے ایک لمحے کے لیے مسکرا کر اس کی جانب اس طرح دیکھا، جیسے کہہ رہی ہو۔ "تم بھی مجھے پاگل بنانے آئے ہو۔ یہاں رات کے اندھیروں میں آنے والا ہر مرد یوں ہی کہتا ہے اور جب وہ واپس جانے لگتا ہے تو سب کچھ بھول جاتا ہے اور انجان بن جاتا ہے۔"

اپنی طرف جمیلہ کو اس طرح دیکھتے ہوئے وہ پھر بولا، "بتاؤ جمیلہ! کیا ایسا نہیں ہو سکتا؟" "نہیں!" وہ قطعیت سے بولی۔ اور اس لمحے وہ جذباتی ہو گیا، "آخر کیوں نہیں، کیوں نہیں، کیوں نہیں؟؟؟"

"اس لیے کہ میں مجبور ہوں۔" وہ بڑے اطمینان سے بولی۔

"کس نے تمہیں مجبور کیا ہے؟"

"دل نے! جمیلہ بولی، میں اپنے کالے مرد سے محبت کرتی ہوں اور تمہیں دھوکہ نہیں دے سکتی۔ اب تم ہی بتاؤ میں کیا کروں؟"

(کون کہتا ہے کہ طوائف مکار ہوتی ہے؟) پھر سب کچھ بھول کر جمیلہ بولی، "کیا دروازہ بند کر دوں؟"

"نہیں!" یہ کہہ کر اس نے جیب سے روپے نکال کر اس کی طرف بڑھا دیئے۔ اور دوسرے لمحے وہ تیزی سے دروازہ پھلانگ گیا۔

اور جب وہ کافی دور سڑک پر نکل آیا تو اچانک اسے احساس ہوا کہ وہ اخبار جس میں نینا کی تصویر چھپی تھی وہ جمیلہ کے گھر ہی بھول آیا تھا۔ "نینا اور جمیلہ! جمیلہ اور نینا" اچانک اس کے ذہن میں دو عورتوں کی تصویریں ابھریں اور خلط ملط ہو گئیں۔ اور پھر ان دونوں تصویروں کے

گڈمڈ ہونے سے جو تصویر ابھری وہ ایک عورت کی تصویر تھی - جو طوائف ہو کر بھی عورت ہی تھی - جو خود غرض نہیں تھی، دھوکہ باز نہیں تھی اور نہ ہی حسین فلرٹ بلکہ محض ایک عورت!!

"— ایک ایسے شخص کا افسانہ جو زندگی کے تنہا لمحوں میں جانے کتنی بار مرا اور جیا — پھر ایک دن وہ اپنا گھر بھی بھول بیٹھا۔ اس لڑکی کی طرح جو اس کی محبت کو بھول کر زندگی کے ھنگاموں میں کہیں گم ہوگئی —"

تنہا تنہا
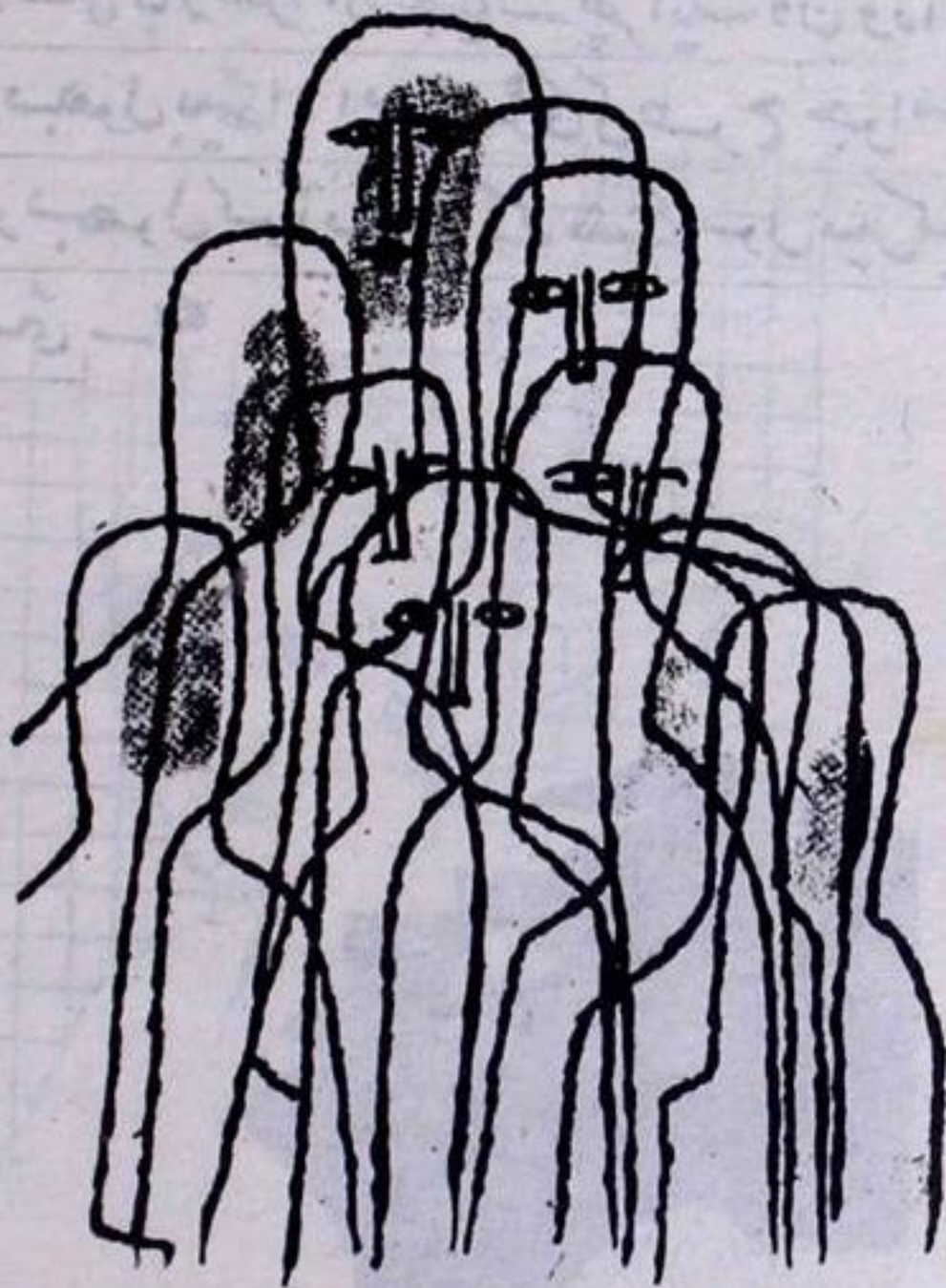
تنہا سڑک پر وہ بالکل تنہا تھا، لیکن وہ تنہا نہیں تھا۔ اس کے پیچھے یادوں کا قافلہ اس کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا، اس کے پیچھے اس کی ناکامیاں تھیں، محرومیاں تھیں، نامکمل آرزوئیں تھیں اور تلخ ترش یادیں!

یہ سب میرے ساتھ ساتھ کیوں ہیں؟" اس نے سگریٹ سلگایا، کئی آوازیں ابھریں جنہیں اس نے محسوس کیا (اندر کی آوازوں کو محسوس کرنا بھی کتنی اداس بات ہے)، یکایک ایک سایہ لرزتا ہوا اس کے قریب سے گزر گیا۔؟

"ہلو! تم رات گئے سڑکوں پر یوں تنہا مارے مارے کیوں پھر رہے ہو؟" وہ کسی کو نہیں پہچان پایا۔

"مغرور اور خود پسند لڑکا۔" آواز اس کے کانوں تک پہنچی اور لمحوں کی بارش سے اس کا سارا جسم بھیگ گیا۔

اس نے پھر سوچا، "ہاں! تو میں سوچ رہا تھا گھر کیوں نہیں ملتا! آخر کیوں نہیں؟؟"

تم محض سائے ہو اور سایوں کا کوئی گھر نہیں ہوتا۔"

تم جھوٹ بکتے ہو، تم کمینے ہو، میں اپنا گھر تلاش کر کے ہی رہوں گا چاہے گھر پہنچ کر دم ہی کیوں نہ دے دوں۔" اس نے آواز کو ڈانٹا۔ ہر طرف

قہقہے بکھر گئے۔ دیوانہ۔ ہاہا۔ ہاہاہا۔ بھلا آدم اور ہوا کا بھی کوئی گھر تھا؟ چلتے چلتے اس نے پھر سوال کیا۔ "تمہارا نام۔؟" "میرا کوئی نام نہیں، میں بے نام ہوں۔" فضا میں پھر قہقہے گونج اٹھے اور وہ لرز لرز گیا۔ (اف خدایا یہ آوازیں کہاں سے آرہی ہیں؟)

کئی گھنٹوں کی مسلسل جدوجہد کے بعد وہ اپنے گھر کے دروازے تک جا پہنچا۔ اس کی آنکھیں بے نور تھیں اور جسم بے جان۔ دراصل وہ تنہا لمحوں میں جانے کتنی بار مرا اور جیا تھا۔

ڈائننگ ٹیبل پر وہ اوندھے منہ گر پڑا۔ رات بول رہی تھی اور لمحوں کی بارش برابر جاری تھی۔ اس نے سوچا آج مجھے فیصلہ کرنا ہی ہے۔ گھر کیوں نہیں ملتا۔ آخر کیوں نہیں؟؟ میز کے اردگرد چھ عدد کرسیاں پڑی تھیں اور وہ تمام کرسیوں پر براجمان تھے ایک جو آرٹسٹ تھا، دوسرا جو اداکار تھا تیسرا جو جرنلسٹ تھا، چوتھا جو ناول نگار تھا، پانچواں جو بے انتہا مذہبی اور رجعت پسند تھا اور چھٹا جو کمینہ، مکار اور شرابی تھا!

اس نے سب کی طرف گھور کر دیکھا اور سوچا، ان سب کے بغیر میری شخصیت کتنی کھوکھلی اور بے جان ہے۔" ان سب نے اسے گھورا اور ایک آواز ہو کر بولے۔" ہم جانتے ہیں تمہارے دکھ کیا ہیں اور ان کا مداوا کیا ہے؟"

اس نے نفرت سے ان سب کی طرف دیکھا اور بولا، بکواس بند کرو۔ تم سب خود زندگی سے ہارے ہوئے ہو، تم لوگ سب سراب کے پیچھے بھاگتے ہانپ رہے ہو۔ کیا یہ درست نہیں کہ آرٹسٹ نے ایک لڑکی سے محبت کی تھی اور تم جو ناول نگار ہو اپنے ناولوں سے آنی بھی قیمت وصول،

نہیں کرسکے کہ تم آرٹسٹ کی محبت کو زندہ رکھنے کے لیے پیسے کا ذریعہ ثابت ہوتے اور تم جو اداکار ہو، اسٹیج، ٹیلیویژن اور فلم کے کانٹریکٹ میں ایسے الجھے رہے کہ تم نے بھی آرٹسٹ کے لیے کچھ نہ کیا اور اس کی محبت مرگئی۔"

چوتھی کرسی پر بیٹھا ہوا جرنلسٹ بولا، "میں جو کچھ اس کے لیے کرسکا وہ میں نے کیا۔ اخبارات اور رسائل میں۔ میں نے سفارش کی اور اس کے انٹرویو چھپوائے اور اسے شہرت دی۔

"پاگل نہ بنو۔" اس نے جرنلسٹ کو جھاڑا۔ "شہرت سے محبت کو خریدا نہیں جا سکتا۔ یہ مظلوم ہے اور مکمل ہے اور اسے مذہبی شخص نے درد کی صلیب پر مصلوب کیا ہے۔" مذہبی شخص جھلا کر بولا، "میں مجبور تھا، میری پرورش ہی ایسے ماحول میں کی گئی تھی۔ میں نے اس کے ساتھ ظلم نہیں کیا۔ جب بھی اس نے غلط راستہ اختیار کیا۔ میں نے اس کے ضمیر کو جھنجھوڑا اور بس!"

یکایک مکار اور کمینہ شخص طیش میں آگیا، تم پاگل ہو۔ جب بھی میں نے اسے احساس دلایا کہ غلط راہیں ہی کامیابی کی طرف جاتی ہیں، تو تم نے اسے روک دیا، لیکن اس دن تم کہاں تھے جس دن آرٹسٹ نے اس لڑکی سے اپنی ذات کے بارے میں اس کی پسند جاننی چاہی تھی اور لڑکی نے آرٹسٹ سے شادی کرنے سے انکار کر دیا تھا، کیونکہ آرٹسٹ کی جیبیں خالی تھیں اور اس کی شخصیت کھوکھلی تھی، تب میں نے اسے سہارا دیا تھا اور اس کی جیب سے روپے اڑا کر اسے بار تک چھوڑ آیا تھا۔ اور اسی دن اس نے بے انتہا پی تھی، اس کے پیر لڑکھڑا رہے تھے اور چہرا خون کی حدت سے جل رہا تھا اور وہ جذباتی ہو کر شراب خانے میں بے انتہا رو رہا تھا۔"

مذہبی شخص نے بڑی ملائمیت سے کہنا شروع کیا، "لڑنے سے کچھ حاصل

نہیں، میری بات سنو! تم جو اداکار ہو، ہر لڑکی سے ناظرین کے سامنے محبت کرتے اور ہر لڑکی سے یہی کہتے ہو کہ تمہارے بنا ایک پل بھی نہیں جی سکوں گا۔ کیونکہ تمہارے فن کی بنیادیں جھوٹ پر ہیں حالانکہ میں جانتا ہوں کہ تم نے زندگی میں ایک بار شدت سے صرف کو ایک لڑکی کو چاہا۔ اور تم نے اس لڑکی کو اس لیے چاہا کہ وہ تمہارا آئیڈیل تھی۔

اور تم جو ناول نگار ہو، تم نے بھی اس لڑکی کو چاہا، اس لڑکی سے انتہائی زیادہ محبت کی اور جانے کتنے خیالی گھوڑے دوڑائے اور ہر ناول نگار کی طرح جانے کتنے سنہرے خواب دیکھے۔ اور تم۔ تم جو جرنلسٹ ہو، میں جانتا ہوں۔ تم نے بھی اسی لڑکی سے اخباری کیریئر کی طرح محبت کی، کیونکہ وہ لڑکی ٹیبل ٹاکس بڑے سلیقے سے کرتی تھی۔ اور تم میں وہ شام کے اخبار کی طرح دلچسپی لیتی تھیں اور تم۔ مصور!

تم نے بھی اس لڑکی کو چاہا اور ادھے آسمان پر بکھری ہوئی شفق کی طرح اس کی شخصیت کو محسوس کیا اور تمہاری خواہش تھی کہ تم اس لڑکی کا حسین سا پورٹریٹ بنا ڈالو، مگر اس لڑکی نے موڈل بننا پسند نہیں کیا اور تم سمجھ بھی نہ سکے آخر کیوں۔ اور ہاں! تم جو کمینے شرابی ہو۔ تم شہر کے مختلف شراب خانوں میں کبھی جرنلسٹ، کبھی ادیب، کبھی آرٹسٹ، کبھی اداکار بن کر شراب پیتے رہے ہو، تم صرف لفنگے ہو۔ تمہاری کمزوری بھی وہی لڑکی تھی تم نے اسے خواب دکھلائے پھر بھی وہ تمہارے جال میں نہ پھنس سکی تب تم نے اسے اپنے خیالوں میں اپنے بستر پر اپنے ساتھ لٹایا اور اس کی اپنے دوستوں میں تشہیر کی، اور میں جو محبت کو خدا کی عبادت سمجھتا ہوں اور ہر کسی کے دکھ محسوس کر کے روتا ہوں میں بھی اعتراف کرتا ہوں کہ میں نے بھی اسی لڑکے کو چاہا تھا اور شدت سے اپنی بیوی بنانا چاہا تھا

لیکن میں تم سب سے افضل ہوں کیونکہ آج تک شاید اسی لڑکی کو یہ بھی نہ معلوم ہو سکا کہ میں اس کی محبت میں گرفتار ہوں۔"

مذہبی شخص خاموش ہو گیا تو وہ بولا "تم سب اپنی اپنی راہوں پر واپس آجاؤ، میں گزرے ہوئے ہر لمحہ کی قیمت وصول کروں گا، میں نے اس لڑکی کو انتہا سے زیادہ چاہا اور اپنے دل میں عہد کیا تھا۔ اے حوّا کی بیٹی! اگر میں تجھے نہ پا سکا تو تمام عمر کنوارا رہوں گا، کیونکہ کوئی اور لڑکی مجھے نہیں پڑھ سکی۔" مگر یہ سن کر اس لڑکی نے بے باک قہقہہ لگایا تھا جس کی بازگشت میں آج بھی محسوس کرتا ہوں اور وہ میرے لیے چمکیلی چیز بن گئی جو سونا نہیں ہوتی۔! لیکن میں اسے زندگی بھر اگر بھولنا بھی چاہوں تو نہیں بھول سکتا، کیونکہ وہ لڑکی ہر لمحہ میرے ذہن پر حکمرانی کرتی ہے۔" یہ کہہ کر وہ بے دم ہو گیا اور ہانپنے لگا۔

اداکار نے آرٹسٹ سے ہاتھ ملایا۔ آرٹسٹ نے جرنلسٹ کا منہ چوم لیا، ناول نگار نے قلم سنبھالا اور جرنلسٹ نے تشہیر کا وعدہ کیا۔ مذہبی شخص نے دعائیہ گیت گایا۔ اور شرابی لڑکھڑاتا ہوا وہاں سے چل دیا۔ وہ سب کے سب اس کے پیچھے بھاگے اور اسے جا لیا۔

اور دوسرے لمحہ وہ سب ایک دوسرے میں مدغم ہو گئے۔

دور کہیں موذن کی آواز فضائے بسیط میں گونج رہی تھی۔ نیا سورج طلوع ہو رہا تھا اور وہ سر تھامے میز پر تنہا بیٹھا سوچ رہا تھا۔ اور وہ لڑکی جو اس کی محبت تھی، اس کا ماضی تھی، اس کی محبوبہ تھی، اس کی قاتل تھی۔ ہاں وہی لڑکی مسہری پر اپنے دو بچوں کو چمٹائے بے خبر سو رہی تھی۔!

"—— زندگی کے اس موڑ کی کہانی جہاں انسان
تو انسان، جانور بھی خود غرضی کا روپ دھار
لیتے ہیں۔ اس نے ایک لڑکی سے شکست کھا کر
ایک کتیا سے دل لگایا مگر خواہشات کے دھارے
میں جم کر وہ بھی اسے تنہائیوں کے عذاب
میں ڈبو کر گم ہو گئی ——"

موڑ

اس روز جب میں آفس سے لوٹا تو لوسی حسبِ معمول میری منتظر تھی۔ جوں ہی میں گیٹ تک پہنچا وہ دم ہلاتی ہوئی تیزی سے آئی اور میرے قدموں میں لوٹنے لگی۔ میں نے پیار سے اسے تھپکا دیا اور لان سے ہوتا ہوا کمرے تک چلا آیا۔ برآمدے میں آ کر وہ دم ہلاتے ہوئے تھم گئی لیکن جب میں کپڑے تبدیل کر کے واپس باہر آیا تو وہ جانے کہاں چلی گئی تھی۔!

منہ ہاتھ دھو کر میں لان میں بچھی ہوئی کرسی پر بیٹھ کر شام کا اخبار پڑھنے لگا۔ اس عرصے میں رحمان چائے بنا کر لے آیا اور چائے پیالی میں انڈیلتے ہوئے اس نے دو لفافے میرے ہاتھ میں تھما دیئے۔!

ڈاک کے معاملے میں ویسے بہت کمزور واقع ہوا ہوں اگر میں مر رہا ہوں اور ایسے موقع پر ہرکارہ ڈاک لے کر آ جائے تو میں شاید اس وقت تک مر بھی نہ سکوں جب تک خط پڑھ نہ چکوں۔! چنانچہ چائے کو بھول کر میں نے پہلا لفافہ چاک کیا۔ میرا اندازہ صحیح رہا۔ یہ ممی کا ہی خط تھا۔

ممی کو ان دنوں جانے کیا ہو گیا ہے۔ بس ہر خط میں لڑکیوں ہی کی باتیں کرتی ہیں فلاں لڑکی اتنی خوبصورت ہے کہ چاند بھی شرما جائے

فلاں لڑکی اتنی سمارٹ ہے وغیرہ وغیرہ۔ اب ممی کو بھلا کون سمجھائے
کہ مجھے شادی کرنی ہی نہیں، فلاں لڑکی اسمارٹ اور فلاں لڑکی چاند جیسی
ہے تو میں کیا کروں۔؟

ممی ڈارلنگ! تم بھی کتنی سیدھی سادی ہو تم یوں کیوں نہیں سوچتیں
کہ چاند کو بھی گرہن لگتا ہے اور اس میں بھی گہرا داغ ہے۔ شادی تو دو دلوں
کا حسین سودا ہے اور یہ سودا کرتے وقت میں سب کچھ ہار چکا ہوں اور اب
میرے پاس رکھا ہی کیا ہے؟ جی چاہتا ہے کہ ممی کو لکھ دوں ممی پلیز
مجھے نہ ستاؤ۔ شادی کا نام سن کر میرا سارا ذہن سلگ اٹھتا ہے اور پھر اس
آگ کو بجھانے کے لیے مجھے ڈرنک کرنی پڑتی ہے۔ لیکن۔ لیکن ممی کو
میں سب کچھ لکھ سکتا ہوں پر لکھ نہیں سکتا۔ میں تو ان سے ذرا رد کھے
پن سے بات بھی کروں تو وہ بے تحاشا رونے لگتی ہیں۔ پپا کا ذکر کر کے
وہ بے ہوش ہو جاتی ہیں۔ اب انہیں بھلا کون سمجھائے۔

اچانک لوسی دھیمی آواز میں بھونکتی ہے۔ اور اس لمحہ مجھے احساس
ہوتا ہے، جیسے یہ لوسی کی آواز نہ ہو بلکہ نشی کی گاتی ہوئی آواز ہو۔

"خط پڑھتے رہیے گا۔ چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے۔۔"

یکایک چونک کر میں لوسی کی طرف دیکھتا ہوں جو میرے قریب کھڑی
برابر دم ہلائے جا رہی ہے۔ اچانک میں یادوں کے بھنور میں پھنس جاتا
ہوں۔

ان دنوں پپا کا انتقال ہو چکا تھا اور میں بی۔ اے کے آخری
سال کا طالب علم تھا۔ پپا کی موت نے ممی کے سارے منصوبوں پر پانی
پھیر دیا۔ اپنی عزت اور خاندانی وقار کے ناطے آہستہ آہستہ وہ ساری جمع شدہ

پوچھی لٹاتیں رہیں۔ آخر ایک دن نوبت یہاں تک آ پہنچی کہ مجھے تعلیم ادھوری
چھوڑ کر ملازمت کرنی پڑی۔ اور جس دن نشی کی ممی کو ہماری گرتی ہوئی حالت
کی خبر ہوئی تو نوبت یہاں تک آئی کہ انہوں نے نشی کو مجھ سے ملنے کے لیے
منع کر دیا اور خود بھی ہمارے گھر آنا جانا بند کر دیا۔ لیکن مجھے نشی پر اعتماد تھا
اپنی محبت اور اپنے خلوص پر مکمل بھرم۔ ہم مستقبل کے بارے میں کیا کیا
باتیں نہ کر چکے تھے۔ اکثر نشی مجھے سگریٹ پیتے ہوئے دیکھ کر چھیڑتی۔ خدارا
اس قدر اسٹائل سے سگریٹ نہ پیا کیجئے ورنہ لڑکیاں مر مر جائیں گی۔ پھر بڑی
اپنائیت سے میری نکوٹین زدہ انگلیوں کو دیکھ کر بڑے پیار سے کہتی "بس
اب آپ زیادہ سگریٹ نہیں پئیں گے سمجھے؟" یہ کہہ کر وہ خاص اسٹائل
سے مجھے گھورنے لگتی۔ اور میں فوراً قسم کھا لیتا "اب زیادہ سگریٹ پیوں
تو میرے ہونٹ جلیں۔ بس اب تو خوش ہو نا؟" اکثر وہ چائے بنا کر دیتے
وقت مجھ سے کہتی،

"چائے سے تو آپ کو عشق ہے۔ خدارا اتنی چائے نہ پیا کیجئے!
کیسی باتیں کرتی ہو نشی! چائے اور وہ بھی تمہارے ہاتھ کی بنائی ہوئی۔
اس سے بڑھ کر بھلا دنیا میں اور کیا چیز ہو سکتی ہے۔ میں آنکھوں میں آنکھیں
ڈال کر کہتا۔ اور اس لمحہ وہ شرماتی لجاتی ہوئی میرے سامنے بیٹھ جاتی میں
اسے چھیڑتے ہوئے کہتا، "نشی جی چاہتا ہے کہ تم سدا یوں ہی میرے سامنے
بیٹھی رہو اور میں یونہی تمہیں تکتا رہوں۔" اس لمحہ وہ شرما جاتی۔

لیکن جب سے نشی کی ممی نے ہم لوگوں سے تعلقات ختم کر لیے تھے
وہ بھی مجھ سے ملتے ہوئے جھجکنے لگی تھی اور یہ دیکھ کر میری رہی سہی قوت
بھی جاتی رہی اور ان دنوں میں شکست خوردہ سا ہو کر خودکشی کرنے کے

بارے میں سنجیدگی سے سوچنے لگا تھا۔

ممّی اکثر سمجھاتیں۔ میرے حوصلے بڑھاتیں اور وقت کی اونچ نیچ بتاتیں اور آنے والے کل اور خوشنما مستقبل کے سنہرے خواب دکھاتیں لیکن میں تو ہارا ہوا ایک ایسا جواری تھا جس نے پہلے ہی داؤ پر اپنا سب کچھ ہار دیا تھا۔۔۔۔ اور۔۔۔۔۔ پھر ایک دن ایسا ہوا کہ نشی کی شادی ایک امیر زادے سے ہو گئی۔ ممّی میرے درد کو سمجھ رہی تھیں پر وہ کتنی مجبور تھیں۔ اور بھلا وہ کر بھی کیا سکتی تھیں۔

اور اس رات میں سلگتا رہا۔ اور سگریٹ پر سگریٹ پھونکتا رہا۔ اور اسی رات میں نے فیصلہ کر لیا۔ کہ اب میں زندگی بھر شادی نہیں کروں گا۔

لیکن کچھ دنوں بعد دل میں ایک انجانی سی خواہش نے انگڑائی لی، نشی سے ایک بار مل کر تو دیکھو کیا وہ بھی تمہاری طرح تڑپ رہی ہے۔؟

کچھ دنوں بعد خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ میں ایک شام سگریٹ پیتا ہوا خیالات میں الجھا الجھا سا مال روڈ پر چلا جا رہا تھا کہ اچانک سامنے سے نشی اپنے شوہر کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ہوئے ہنستی چہکتی ہوئی چلی آ رہی تھی۔ اچانک مجھے کچھ ایسا محسوس ہوا۔ جیسے میرا ہاتھ بھول سے بجلی کے ننگے تار پر جا پڑا ہو۔ دوسرے لمحہ میں نے اپنے آپ کو سنبھالا اور نشی کی نگاہوں میں جھانکا۔ سامنے آتے آتے اس نے میری طرف ایک لمحہ کے لیے دیکھا اور کچھ بوکھلا سی گئی۔ مگر دوسرے لمحہ جانے کس بات پر وہ بے ساختہ زور سے ہنس پڑی۔ آگے جا کر ایک موڑ تھا۔ میں رکا اور میرا جی چاہا کہ قریب جا کر اس کے منہ پر ایک زوردار طمانچہ دے ماروں اور اسے اس کے شوہر کے سامنے رسوا کر دوں پھر خیال آیا کہ وہ عورت ہے۔ جو کمزور بھی ہے

اور مجبور بھی!

اگر دوسری بار اسی طرح نشی اور میرا سامنا ہو جاتا۔ تو یقیناً میرا ہارٹ فیل ضرور ہو جاتا اسی لیئے اس رات میں نے گھر لوٹتے ہی ممی سے کہا، "کہ میں کسی دوسری جگہ جاکر ٹھیکیداری کا کام کرنا چاہتا ہوں۔ اس طرح کب تک معمولی نوکری کرتا رہوں گا۔" شاید بات معقول تھی ممی کی سمجھ میں آگئی۔ اور ممی کے زیورات بیچ کر میں ٹھیکیدار بن گیا۔ اور... اور.... آج میں نے بہت کچھ کما لیا ہے۔ ممی کو پپا والا مکان بے حد عزیز ہے۔ اسی لیے ابھی تک وہ وہیں ہیں اور خوش ہیں۔

دل کے بہلاوے کے لیے یہاں پر بہت سے دھندے ہیں، کلب لڑکی، شراب اور گھر کے آنگن میں پیاری پیاری سے ایلیشین کتیا۔ جس سے میں عشق کی حد تک محبت کرتا ہوں!

لوسی کا خیال آتے ہی میں چاروں طرف دیکھتا ہوں۔ لیکن پتہ نہیں وہ کہاں چلی گئی۔

"لوسی! لوسی!" وہ ہوتی تو ضرور آتی۔ میں ہاؤس گاؤن سنبھالتا ہوا گیٹ تک آگیا ہوں۔ لوسی گیٹ کے قریب کھڑی ہے اور چار کتے اسے بڑی للچائی نگاہوں سے تک رہے ہیں۔ یکایک مجھے ہنسی آجاتی ہے۔ ہوں! تو نوبت یہاں تک آپہنچی! جنابہ عشق بھی لڑا نے لگیں اچانک مجھے کالج کی وہ لڑکی یاد آتی ہے جس کے عشق میں چار لونڈے گرفتار تھے اور چاروں کالج کے گیٹ سے دور بالکل اسی طرح اسے تاکا کرتے تھے۔

"لوسی! آؤ اندر چلیں!" میں اسے اندر بلاتا ہوں۔ وہ میرے سامنے گھاس پر بیٹھی مڑ مڑ کر ان چاروں کتوں کی طرف دیکھ رہی ہے۔

مگر جب دوسرے دن میں آفس سے واپس آیا تو یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ ایک بھورا سا موٹا سا کتا لوسی کے پاس بیٹھا تھا۔ اور وہ دونوں کھیل رہے تھے۔ یہ کون سا کھیل تھا۔؟

"ہوں! تو نوبت اب یہاں تک بھی آپہنچی۔" میں نے سوچا اور قریب جاکر اس بے ہودہ کتے کو ایک لات رسید کی۔ لات کھاکر وہ میرے اوپر غراتا ہوا چلا گیا اور لوسی بے بسی سے اسے تکتی رہ گئی۔!

شام میں دعوت میں چلا گیا۔ اور تھکا ہارا آیا اور پلنگ پر گر کر سو گیا۔ صبح ناشتہ کرتے وقت لوسی کو میں نے نہیں دیکھا تو رحمٰن سے پوچھا، "بھئی لوسی کہاں ہے؟" "صاحب! جب شام آپ چلے گئے تھے تب ہی سے وہ منہ گرائے لان میں پڑی تھی۔"

"اوہ! اچھا میں دیکھتا ہوں!" میں گھبرا کر لان تک آیا لیکن لوسی وہاں نہیں تھی۔ پھر ساری کوٹھی چھان ماری لیکن اس کا پتہ نہ چلا۔ آس پاس کے تمام بنگلوں میں رحمان دیکھ آیا۔ مگر وہ ہوتی تو ملتی؟ پتہ نہیں۔ وہ کہاں چلی گئی یا کوئی اسے پکڑ کر اپنے ساتھ لے گیا۔ یہ ایک معمہ تھا جو کسی طرح حل ہی نہ ہوتا تھا۔!

تقریباً ایک ماہ بعد میں رسالہ روڈ سے گزر رہا تھا۔ سڑک کے موڑ پر میں نے دیکھا جیسے لوسی منہ گرائے جارہی ہے۔ اچانک میں نے گاڑی روک دی اور گاڑی سے اتر کر بھاگتا ہوا موڑ تک پہنچا۔ میرا شبہ صحیح تھا۔ وہ لوسی ہی تھی، کمزور، مرجھائی، مرجھائی سی، اور اس کے ساتھ وہی بھورا موٹا سا کتا۔

اور اس لمحہ میں جذباتی ہو گیا۔ اور پوری آواز سے دھاڑا۔

"لوسی! لوسی! لوسی!!"

میری آواز سن کر اس نے میری طرف دیکھا۔ لیکن دوسرے لمحہ وہ دونوں تیزی سے بھاگ کر موڑ کی آڑ میں چلے گئے۔ اور اس لمحہ میں نے گھبرا کر سوچا۔

"یہ...... یہ......

.... لوسی ہے۔

.... نشی ہے۔

..... یا..... یا

پھر

صرف زندگی کا ایک موڑ ۔۔؟؟

”فلم نگری کے اس احساس ادیب کی کہانی
جو شہرت کی بلندیوں تک جا پہنچا۔ پھر جب اس
کی نئی فلم فلاپ ہوئی تو وہ خود فلاپ ہو گیا، پھر
یوں ہوا کہ فلم نگری کے لیے اس کا نام اچھوت بن
کر رہ گیا۔ خود غرض معاشرے کا قصہ جس نے
ایک بڑے انسان کو پاگل بنا دیا۔“

دھواں دھواں

وہ فلم انڈسٹری کا بہت بڑا رائٹر تھا، اتنا بڑا کہ اس کی لکھی ہوئی ہر فلم گولڈن جوبلی مناتی تھی۔ اس کی ہر کہانی کا بڑا تھیم ہوتا تھا اور وہ بڑے موضوع پر بڑی کہانی لکھتا تھا۔ اس لیے وہ فلم انڈسٹری کا بڑا رائٹر تھا۔ فلم انڈسٹری کا ہر ہیرو، ہر بڑی ہیروئن اور بڑے سے بڑا ڈائریکٹر اس کی عزت کرتا تھا، اس کے لئے کہ اس کا بنک بیلنس بڑا تھا۔ اور اس کا دل سمندر تھا۔

اُس دن مجھے "ریت پریت" کے پروڈیوسر نے سائن کیا تھا۔ اور اُس دن میں بہت خوش تھا کیونکہ میری جیب میں سو سو روپے کے بیس نوٹ انگڑائیاں لے رہے تھے۔ جب میں بہت زیادہ خوش ہوتا ہوں یا بہت زیادہ اداس، اس دن میں بار میں جاکر اپنی خوشی میں شراب پی کر اور بھی اضافہ کرتا ہوں یا پھر بے انتہا پی کر اور بھی زیادہ اداس ہو جاتا ہوں۔

شام ہو چلی تھی۔ اکثر شام کے وقت اسٹوڈیوز میں اچانک زندگی جاگ اٹھتی ہے۔ کیونکہ شوٹنگ ختم کرنے کے بعد اکثر لوگ اسٹوڈیو کے لان میں بے فکر بیٹھ کر فلم پر ڈسکس کرتے ہیں۔ صحافی، کیمرہ مین، رائٹرز، ہیرو، ہیروئن، ہدایت کار اور فلم میں کام کرنے کے شوقین لڑکے اور لڑکیاں اسٹوڈیو کے مختلف گوشوں میں بیٹھ کر خوش گپیاں کیا کرتے ہیں۔

"ریت پریت"، کا ڈائریکٹر زاہد جمال میرے قریب بیٹھا تھا اور میں کوسین لکھ رہا تھا۔ لکھتے لکھتے اچانک مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میری جیب چیخ چیخ کر مجھ سے کچھ کہہ رہی ہے۔ میں نے جیب پر ہاتھ رکھ کر جیسے اسے تھپکا دیا اور زاہد جمال کی طرف غور سے دیکھا مگر وہ سائڈ ہیروئن سے باتیں کرنے میں مگن تھا۔ میں نے زاہد جمال سے کہا۔ "سنتے ہو! شام ڈوب رہی ہے اور رات کی دلہن ریشمیں گیسو بکھرائے خراماں خراماں اپنے محبوب چاند کی طرف جا رہی ہے۔"

"واہ واہ، بہت خوب ہے،" زاہد جمال چیخ پڑا، کیا ڈائیلاگ لکھا ہے!"

سائڈ ہیروئن نے چونک کر میری جانب دیکھا میں نے زاہد جمال سے کہا، "حضور یہ مکالمہ نہیں ہے بلکہ میرے دل کی پکار ہے۔ میرا قلم تھک گیا ہے اور میرا جی چاہتا ہے کہ" اچانک سائیڈ ہیروئن کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی "اچھا میں چلتی ہوں۔"

سائڈ ہیروئن اٹھ کر سائیڈ ہیرو کو نظر انداز کرتی ہوئی اجے کمار کے قریب جا کھڑی ہوئی اور مسکرا مسکرا کر اسے لبھانے کی کوشش کرنے لگی۔ میں اور زاہد جمال اٹھ کر اسٹوڈیو کے بار میں چلے آئے ہم نے ابھی پہلا ہی پیگ پیا تھا کہ اچانک ایک میلا کچیلا آدمی ہماری میز پر آکر بیٹھ گیا۔ اس کے چہرے پر بے انتہا سلوٹیں تھیں جیسے اس کا چہرہ آگ سے جھلس گیا ہو۔ اس کی داڑھی بے ترتیب بڑھی ہوئی تھی اور کپڑے انتہائی بوسیدہ تھے۔ میز پر بیٹھ کر اس نے قہقہہ لگایا اور میری جانب دیکھ کر مجھ سے پوچھا "کیا میں یہاں بیٹھ سکتا ہوں؟ تم مجھے پہچانتے ہو؟"

ایک لمحے کے لیے مجھے خیال ہوا شاید یہ کوئی کیریکٹر ایکٹر ہے اور سیٹ

سے سیدھا میک اپ میں ادھر چلا آیا ہے۔ اس لئے میں نے بڑی خوش اخلاقی سے اس سے کہا۔ "تشریف رکھیے۔ آپ کیا پینا پسند کریں گے؟"

میری بات سن کر وہ اور زور سے قہقہے لگانے لگا اور اس لمحے اچانک میں نروس ہو گیا، میں نے گھبرا کر زاہد جمال کی طرف دیکھا، وہ بڑے اطمینان سے بیٹھا ہوا اس شخص کو دیکھ رہا تھا۔ اچانک اس نے پھر کہا،

"کیا تم مجھے واقعی پلا رہے ہو؟"

"ارے کیوں نہیں میں تو آپ سے پوچھ رہا ہوں کہ آپ کیا پینا پسند کریں گے؟"

اچانک وہ ہنستے ہنستے اداس ہو کر رونے لگا، پھر میز پر رکھی ہوئی شراب کی بوتلوں کو آپس میں ٹکرا کر روتا ہوا بھاگ گیا۔ بوتلیں آپس میں ٹکرانے کی وجہ سے ٹوٹ گئیں اور شراب میز پر بکھر کر بہنے لگی۔ میں نے غصہ سے بے تاب ہو کر زاہد جمال سے کہا۔

"لوگ اپنے آپکو ہر جگہ بڑا اداکار پوز کرتے ہیں، بار میں بیٹھ کر مسخرے پن کا مظاہرہ کرنا بھی کوئی بات ہوئی۔"

زاہد جمال بڑے اداس لہجے میں بولا۔ "علی رضا! جانتے ہو یہ کون تھا؟"

"ہو گا کوئی۔ مجھے کیا میرا تو نقصان کر ہی گیا۔" میں نے بیزاری سے کہا۔

"جناب! یہ فلم انڈسٹری کا اے ون رائٹر انور کمال تھا!"

"کیا بکتے ہو؟ کہیں زیادہ تو نہیں پی گئے؟" میں نے زاہد جمال کو ٹوکا۔ "بھلا یہ دیوانہ شخص انور کمال کیسے ہو سکتا ہے؟ وہ تو انڈسٹری کا سب سے بڑا رائٹر ہے۔"

"ہے نہیں پر کبھی تھا۔ لیکن اب مر گیا۔ یہ فلم انڈسٹری ہے پیارے۔ یہاں ہر نئی فلم کے ریلیز ہونے تک لوگ مرتے اور جیتے رہتے ہیں۔" زاہد جمال بولا "کبھی یہ فلم انڈسٹری کا بڑا رائٹر تھا اور فلم انڈسٹری میں ہر طرف سے اس کا طوطی بولتا تھا لیکن جب اس کی نئی فلم "دہن" فلاپ ہوئی تو یہ اس دن آدھا مر گیا۔ اور جب کچھ دن بعد اس کی دوسری فلم "روپ انوپ" فلاپ ہوئی تو اس دن یہ پورا مر گیا۔ پروڈیوسر جو اس کے آگے پیچھے بھاگتے تھے۔ اب اس کی شکل دیکھ کر بھاگنے لگے۔ اور ایک دن اس طرح اس کا بنک بیلنس بھی مر گیا۔ ان ہی دنوں اس کی بیوی کے بچہ ہونے والا تھا۔ بیوی بیمار پڑی تھی اور اس کی جیب میں اتنے پیسے بھی نہیں تھے کہ وہ دوا لا کر اسے پلا سکے اور جس دن اس کی بیوی کی حالت زیادہ خراب ہوئی تو یہ اس دن احمد زیدی کے پاس گیا جو اس کا بڑا یار تھا اور جس کے اوپر اس کے ہزاروں روپے ادھار تھے۔ احمد زیدی نے افسوس کرتے ہوئے کہا "میری جیب میں صرف پانچ سو روپے پڑے ہیں اور مجھے آج اپنے نئے پروڈیوسر کو شراب پلانی ہے۔ پینا چاہتے ہو تو ساتھ چلو مگر پیسے مت مانگو۔" احمد زیدی کی بات سن کر یہ کمال آفاقی کے پاس گیا۔ آفاقی نے اسے بتایا "بھائی میں تو مزدور ہوں، خود ہی کہانی لکھتا ہوں۔ خود ہی میوزک دیتا ہوں، خود ہی ہدایات کاری کرتا ہوں اور کبھی کبھی لیڈنگ رول بھی خود ہی کر لیتا ہوں۔ اگر پیسے ہوتے تو کسی بڑے آرٹسٹ کو نہ بک کرتا۔"

اور جب ہر طرف سے مایوس ہو کر انور کمال گھر پہنچا تو اس کی بیوی تڑپ تڑپ کر جان دے چکی تھی۔ یہ منظر دیکھ کر انور کمال پاگل ہو گیا۔ اور اپنے ہی ہاتھوں دیا سلائی سے اپنے گھر میں آگ لگا دی اور قہقہے لگانے لگا۔ بڑی مشکل سے لوگوں نے آگ پر قابو پایا۔ مگر افسوس گھر بھی جل گیا، گھر والی بھی اور یہ بے چارا

جل کر بھی زندہ رہ گیا۔ اور ہمیشہ کے لیے پاگل ہو گیا۔"

زاہد کمال نے بات ختم کر کے ایک بڑا پیگ اپنے حلق میں انڈیل لیا۔ اور میں شراب اس طرح سپ کرتا رہا جیسے میں شراب نہیں پی رہا بلکہ بے انتہا اداس ہو کر کچھ سوچ رہا ہوں۔

زاہد کمال نے مجھے ٹوکا۔ "کیا سوچ رہے ہو؟ یہ لائن بہت خراب ہے یہاں پر سب لوگ خود غرض ہیں۔"

میں نے زاہد جمال سے کہا۔ لائن کوئی خراب نہیں ہوتی بلکہ لوگ خود ہی خراب ہوتے ہیں۔"

ابھی میں اپنی بات پوری نہ کر پایا تھا کہ وہ پھر بار میں داخل ہوا اور میرے قریب آکر بولا۔

"میں نے لوگوں سے پوچھ لیا ہے۔ تم بتاؤ نہ بتاؤ کس فلم میں ہیرو آ رہے ہو۔ کیا تم جب بڑے ہیرو بن جاؤ گے تو مجھے اپنے پاس بٹھا کر شراب پلانا پسند کرو گے؟"

میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا اور اپنے پاس بٹھاتے ہوئے کہا۔

"ہم سب چاہے کتنے ہی بڑے اور کتنے ہی چھوٹے کیوں نہ ہوں، ہم سب ایک ہیں۔ آپ بھی وہی ہیں جو میں ہوں۔ آپ کو شاید بھوک لگی ہے آپ کچھ کھا لیں۔"

میں نے بیرے کو بلا کر تلی ہوئی مچھلی، فرائی انڈے اور ایک پلیٹ کباب منگا کر اس کے سامنے رکھ دیے۔ وہ بے تحاشا کھانے لگا۔ شاید وہ کئی روز کا بھوکا تھا۔

کھانا کھا کر اس نے اپنے بڑھتے ہوئے شیو پر ہاتھ پھیرا اور اس طرح رویا جیسے

ہنس رہا ہو۔ پھر وہ بڑے اداس بھرے لہجے میں بولا ۔

"لوگ بہت خراب ہیں، آپ کتنے اچھے ہیں، لوگ تو مجھے اپنے پاس بٹھانا بھی پسند نہیں کرتے اور آپ نے مجھے کھانا بھی کھلا دیا۔ لیکن۔ لیکن یہ سب آپ نے کیوں کیا؟ اچھا، سمجھا آپ پروڈیوسر ہیں اور مجھ سے کچھ لکھوانا چاہتے ہیں۔ لیکن، لیکن اب میں بالکل نہیں لکھوں گا جناب۔ اچھا آپ بیٹھیے میں ابھی آتا ہوں۔ وہ ہے نا۔ میری بیوی وہ مجھے آواز دے رہی ہے۔ میں ابھی آتا ہوں۔ یہ کہہ کر وہ قہقہے لگاتا ہوا میری نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔

زاہد کمال نے میری طرف دیکھا اور مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے چاروں طرف آگ لگی ہوئی ہے اور دھوئیں سے میرا سانس گھٹا جا رہا ہے۔

”— روحانیت سے ناراض اس انسان کا قصہ جس نے اپنی ہستی کو شراب کے جاموں میں گم کردیا یہاں تک کہ ہر چیز اس کے لیے اجنبی اجنبی سی ہوگئی —“

دلِ داغ داغ

میلے سے شہر کے ویران شراب خانے میں بیٹھا سوچتا ہوں، "ہم سب اپنی اپنی راہوں سے بھٹک گئے ہیں اور اپنے چہروں پر نقلی خول چڑھا کر زندگی کی ویران گلیوں میں بھٹک رہے ہیں۔"

شراب خانے میں عریاں عورتوں کی تصویریں آویزاں ہیں اور ان عریاں تصویروں کو دیکھ کر میرا ذہن قدیم زمانے کے کھنڈروں میں بھٹکنے لگتا ہے۔ مجھے پکاسو یاد آرہا ہے اور وان گو کے وہ حالات جنہوں نے اسے پاگل بنا دیا اور جنس کے گہرے غاروں میں دھکیل دیا۔ وہ سستی عورتوں کے گرد چکر کاٹنے لگا اور اپنے آرٹ کو بھلا بیٹھا۔ پھر میں ڈی وِنچی اور ماسٹیس کے فن کے بارے میں سوچنے لگا، کرول میکر کی نیم عریاں تصویریں میرے ذہن کے کینوس پر ابھرتے ڈوبنے لگتی ہیں۔ اچانک مجھے ڈی ایچ لارنس کی پینٹنگ یاد آجاتی ہے جس میں آرٹ سے زیادہ فلسفہ پر زور دیا گیا ہے۔

میں ان سستے مصوروں کے بارے میں سوچتا ہوں، جنہوں نے انتقاماً اپنی محبوباؤں کو عریاں کر کے اپنی جنسی بھوک مٹائی یا پھر سستی شہرت کی خاطر ان کے جسموں کو نگاہوں کے ترازو میں تول کر بیچ دیا۔

شمپین کا ایک لمبا گھونٹ بھر کر میں سوچتا ہوں "ہائے آسیہ! تم نے

میرا دل کرچی کرچی کر دیا کاش! تم اتنی مغرور نہ ہوتیں، لیکن نہیں تم مغرور رہو اور اس لیے میں تم سے پیار کرتا ہوں، کیونکہ میں خود بھی مغرور ہوں اور مغرور لوگ مجھے پسند ہیں۔ حسن جب مغرور ہو تو اور بھی حسین لگتا ہے۔''

شراب کا دوسرا گھونٹ لے کر میں زندگی کے بارے میں سوچتا ہوں۔ زندگی تلخ ہے یا شراب؟ زندگی بھی تو ایک شراب ہے۔ جس کی تلخیوں کا نشہ تمام نشوں سے تیز تر ہوتا ہے۔

میرے پیچھے چار ٹیڈی بوائز بیٹھے ہوئے شراب سپ کر رہے ہیں۔ ان کا موضوع ہالی وڈ کی نیوڈ فلمیں ہیں یا سستے معاشقے۔

میرا ذہن نشے میں ڈولنے لگتا ہے۔ اچانک مجھے بٹیلز گویئے یاد آ جاتے ہیں جنہوں نے جوشِ طلب کی مستی میں آ کر بیچارے مذہبی عوام کے سامنے شہرت کی ڈھال ڈال کر جوش سے کہا تھا؟ ''ہم عیسیٰ سے بھی زیادہ پاپولر ہیں۔''

ہا بیچارے بیٹلز! شاید وہ بھول گئے تھے کہ آج بھی لوگ مذہبی جنون میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

سوچتے سوچتے میرا ذہن بھٹکنے لگتا ہے۔ ویٹر مجھے خلائیں گھورتے ہوئے آگے بڑھ کر بل سامنے کر دیتا ہے۔ بل ادا کر کے میں لڑکھڑاتے قدموں سے گھر کی طرف چل دیتا ہوں یکایک ایسا احساس ہوتا ہے جیسے میں خلائیں تحلیل ہو رہا ہوں۔ راستے میں کئی جانے پہچانے چہرے ملتے ہیں

''ہلو۔!''

میں کسی کو پہچان نہیں پاتا۔ راہیں اتنی اندھیری کیوں ہیں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم

تمہاری جلائی ہوئی شمع کیوں بجھ رہی ہے۔ دنیا میں اتنا گھمبیر اندھیرا کیوں ہے؟
اس گہرے اندھیرے میں، میں خدا کو بھی نہیں پہچان پاتا۔ چلتے چلتے میں
خود سے پوچھتا ہوں "تم اپنے بارے میں کیا جانتے ہو۔؟"
کوئی راہ نہیں۔ کوئی دروازہ نہیں۔ کوئی روشنی نہیں۔ پھر ہم کیوں
بھٹک رہے ہیں؟ "تم ذہنی طور پر اتنے پریشان رہتے ہو۔ بہتر ہے کہ
شادی کر ڈالو۔" میرا دوست مشورہ دیتا ہے۔
جواباً میں کہتا ہوں، "تم ہی بتاؤ کیا کوئی لڑکی مجھے ماں کی ممتا، بہن
کا پیار، بھائی کی محبت اور باپ کی شفقت دے سکتی ہے؟؟"
ماں کی ممتا پر میرا دوست احمقانہ انداز میں میری طرف دیکھ کر قہقہہ
لگاتا ہے۔
"احمق، گدھے۔ ہم سب احمق ہیں اور اس طرح الٹی سیدھی باتیں
سوچتے رہتے ہیں، ہمارے ذہن مفلوج ہو گئے ہیں اور ہماری روحیں مردہ
ہو گئی ہیں۔"
پاک یسوع مسیح! کاش تم ایک بار پھر دنیا میں آ سکتے اور ہماری روح
کو اپنے جادو سے جگا سکتے۔ آج دنیا کا ہر انسان درد کی صلیب پر لٹکا ہوا چیخ
رہا ہے۔ خداوندا تو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک بار پھر اپنے کرم سے
دنیا میں بھیج دے، کیونکہ ہم لوگ پتھر کی زمانے کی طرف بڑی تیزی سے لوٹ
رہے ہیں۔ اب وہ زمانہ بھی دور نہیں جب عورتوں کے جسم پر تین پتے اور
مردوں کے جسم پر صرف بال اُگے ہوئے ہوں گے۔ پھر نا جائز رشتے قائم
ہوں گے اور لوگ اپنی اولادوں کو بھی نہیں پہچان پائیں گے۔ خداوند پھر
یوں ہوگا کہ ہم سے ایک مریم پیدا ہوگی اور پھر تیری رحمت سے وہ ایک مسیوع

کو جنم دے گی۔ اور لوگ تجھ سے ٹھٹھا کریں گے اور تیرے اوپر الزام تراشیں گے۔

اور دنیا دیوانگی کے ساحل پر کھڑی قہقہے لگا رہی ہے اور مجھے ڈر ہے کہ کہیں ان قہقہوں کی بازگشت صورِ اسرافیل کی آواز نہ دھار لے۔ تب۔ تب کیا ہوگا؟ پھر شاید یوں ہو کہ ایٹم سمندروں کے پانی میں حلول ہو جائیں۔ ساری مخلوق اس ابلتے ہوئے پانی میں بھاپ بن کر اڑ جائے اور سورج زمین پر آ گرے اور آن کی آن میں ساری دنیا جل کر خاک ہو جائے۔!

یہ سوچ کر میری آنکھیں خوف سے خود بخود بند ہونے لگتی ہیں۔

گھر آ کر میں دل بہلانے کے لیے آسیہ کے بارے میں سوچنے لگتا ہوں۔ نائٹ گون پہن کر پائپ سلگا کر میں پھر سوچتا ہوں، "ہائے ظالم آسیہ! تم اس وقت گہری نیند سو رہی ہو گی اور میں تنہا بیٹھا دھوئیں کا زہر حلق میں اتارتے ہوئے تمہارے بارے میں سوچ رہا ہوں۔ تصویر البم سے نکال کر دیکھتا ہوں اور دل کی باتیں شروع کر دیتا ہوں۔ ہا دیوانہ لڑکا۔!

میرا دل چاہتا ہے آسیہ کہ میں پاگل خانے میں جاؤں اور وہاں کے متنظمین پر دل کھول کر قہقہے لگاؤں۔ پاگلوں! تم نے اچھے بھلے انسانوں کو پاگل سمجھ کر کیوں بند کر دیا ہے؟۔ ہم سب پاگل ہیں اور دنیا پاگل خانہ ہے۔!

اقتدار کی جنگ تم نے نہیں دیکھی آسیہ! بربریت فراڈ ہے اور اقتدار ظلم!

کبھی کبھی یوں ہی بیٹھے بیٹھے دل چاہتا ہے کہ زور زور سے قہقہے لگاؤں لیکن میں تو جب بھی ہنسنا چاہتا ہوں، آنسو ڈھلک پڑتے ہیں۔ دوسرے لمحے مجھے احساس ہوتا ہے کہ آنسو قہقہوں سے زیادہ انمول ہیں۔ میں جانتا

ہوں کہ ہر قہقہے کے بعد ہمیں آنسو بہانے پڑتے ہیں۔

رات ہر لمحہ پگھل رہی ہے۔ وقت کا توازن برابر بکھر رہا ہے۔ پھر نئی صبح طلوع ہوگی۔ پھر دن اور رات گلے ملیں گے۔ جیسے صدیوں سے مل رہے ہیں، مگر کیا۔ کیا میں اور تم بھی کبھی۔؟؟

”—— ایک ایسے شخص کی کہانی جس نے پیٹ کی خاطر
موت سے جنگ چھیڑ رکھی تھی، مگر ہر روز وہ موت
کو شکست دیتا رہا۔

کیا زندگی اتنی ہی ارزاں ہے کہ اسے پیٹ کی
خاطر یوں سرِ بازار موت کے حوالے کر دیا جائے؟“

تین جنازے

نمائش سے اپنے روایتی انداز میں زوروں پر تھی میں ٹہلتے ٹہلتے سرکس بازار چلا آیا۔ اور بازاروں سے یہاں زیادہ رش تھا۔ سرکسی مسخرے سرکس سے باہر بنے ہوئے تختوں کے چھجوں پر بے ہنگم سا ناچ ناچ رہے تھے اور الٹی سیدھی حرکتیں کر کے لوگوں کو ہنسانے کی کوششیں کر رہے تھے۔

میں بازار کے آخری سرے تک جا پہنچا۔ جہاں موت کی چھلانگ کا تماشا روز دکھایا جاتا تھا۔ یکایک میرے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ کیوں نہ آج موت کی چھلانگ والا کھیل دیکھا جائے، موت کی چھلانگ واقعی کوئی معمولی کھیل نہیں ہوتا اور وہ شخص بھی یقیناً غیر معمولی ہوگا جو اتنی بلندی سے روز چھلانگ مارتا ہے اور اپنے آپ کو زندہ رکھے ہوئے ہے۔

ٹکٹ لے کر میں اندر چلا آیا۔ ایک بہت گہرا اور گول گڑھا کھدا ہوا تھا۔ اس کے اندر منہ تک پانی بھرا ہوا تھا اور گڑھے کے تین گز زمین چاروں طرف سے چھوڑ کر بانسوں کی مدد سے ایک حصار بنا دیا گیا تھا۔ جہاں کھڑے ہو کر تماشائی تماشا دیکھتے تھے۔ گڑھے کے ایک کنارے سے ملی ہوئی ایک سیڑھی دو بلیوں کو جوڑ کر بنا دی گئی تھی۔ جس کے اوپری

سرے پر ایک تختہ جڑا ہوا تھا۔

پورے آٹھ بجے شو شروع ہونا تھا۔ اور آٹھ بجنے میں ابھی دس منٹ باقی تھے۔ باہر مسخرے اپنی دلچسپ حرکتوں سے تماش بینوں کو برابر ہنسائے جا رہے تھے اور شو دیکھنے کے شوقین ٹکٹ لے کر اندر داخل ہو رہے تھے۔ جب شو شروع ہونے میں صرف پانچ منٹ باقی رہ گئے تو باہر ریکارڈنگ بند کر دی گئی اور باہر والے تمام مسخرے اندر دائرے میں چلے آئے اور عجیب و غریب حرکتیں کرنے لگے۔ ان مسخروں کو دیکھ کر یوں احساس ہو رہا تھا جیسے ان مسخروں کی زندگی محض ایک مذاق ہے اور یہ کہ ان کی زندگی میں مذاق کے علاوہ دکھ اور درد نام کی کوئی چیز نہیں اور بے انتہا انسانوں کے ہجوم میں میں کھڑا سوچ رہا تھا۔

"پیٹ بھرنے کے لیے ہمیں کتنے روپ دھارنے پڑتے ہیں اور وقت کتنا بڑا مسخرہ ہے جو اچھے بھلے انسانوں کو الٹی سیدھی حرکتیں کرنے پر آمادہ کرتا ہے۔"

جب پورے آٹھ بج چکے تو تمام مسخرے ایک دوسرے کو مارتے، قہقہے لگاتے ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے ہوئے دائرہ پھلانگ کر نظروں سے غائب ہو گئے۔

چند لمحوں کے بعد ایک دبلا پتلا سا آدمی بانسوں کے حصار کو پھلانگ کر دائرے کے اندر آیا۔ اس کے ہاتھ میں مٹی کے تیل کی دو بڑی بوتلیں تھیں۔ آتے ہی اس نے ایک بوتل گڑھے میں پانی کے اوپر چھڑکی اور دوسری بوتل تھامے وہ اوپر سیڑھی کو دیکھنے لگا۔

لوگوں سے ہاتھ ملاتے ہوئے وہ میرے قریب آیا۔ میں نے اس کا

ہاتھ تھامتے ہوئے اس سے پوچھا۔

"سیڑھی پر چڑھ کر چھلانگ لگاتے وقت آپ کو کیسا محسوس ہوتا ہے؟"

میری یہ بات سن کر وہ خوش دلی سے مسکرایا۔ "بہت اچھا"

اس نے ھنس کر کہا۔

"میں تو اس کا اس حد تک عادی ہو چکا ہوں کہ اگر جس روز چھلانگ نہ لگاؤں اس دن ایسا محسوس ہوتا ہے۔ جیسے میں نے دن بھر کچھ کیا ہی نہیں" مگر پھر بھی ہر لمحہ موت میرے قریب کھڑی قہقہے لگاتی رہتی ہے اور میں ہر روز موت پر فتح حاصل کر لیتا ہوں!"

"اس کا معاوضہ تو آپ کو خاصا مل جاتا ہو گا۔"

میں نے اس سے پوچھا۔

اب کی بار وہ سنجیدہ ہو گیا۔

"موت کے دھانے پر کھڑے ہو کر چھلانگ لگانے کا معاوضہ؟ یہی کیا کم ہے جناب کہ ہر روز میں موت کو شکست دے کر زندگی کو گلے لگا لیتا ہوں۔ ویسے پیٹ بھرنے کے لیے خاصے پیسے مل ہی جاتے ہیں۔"

اتنی دیر میں اس کی بیوی اپنی دو سالہ بچی کو لے کر حصار میں چلی آئی۔ وہ مڑا اور اپنی بیوی کے قریب جا کر اپنی بچی کو بے تحاشا پیار کرنے لگا۔ پھر اپنی بیوی کو گہری نظروں سے دیکھتا ہوا اس آدمی کے قریب آ گیا جو مٹی کے تیل کی بوتل لیے ہوئے اس کا منتظر تھا۔ مٹی کے تیل کی بوتل لے کر وہ بلیوں سے بنی ہوئی سیڑھیوں پر چڑھنے لگا اور آخری سرے پر پہنچ کر وہ تختہ پر پیر لٹکا کر بیٹھ گیا۔

دوسرے لمحے اس نے مٹی کے تیل کی بوتل اپنے کپڑوں پر چھڑک کر جیب

سے ماچس نکال کر آگ لگائی، نیچے کھڑے ہوئے آدمی نے بھی ماچس سے گڑھے میں بھرے ہوئے پانی کے اوپر چھڑکے ہوئے تیل کو آگ لگا دی۔

اوپر نیچے آگ کے شعلے بھڑک رہے تھے۔

یہ دیکھ کر تماشائیوں نے تالیاں بجانا شروع کر دیں۔

اور دوسرے لمحے اوپر بیٹھے ہوئے آدمی نے جھانک کر نیچے دیکھا اور نیچے چھلانگ لگا دی۔ اسے دیکھ کر ایک لمحہ کو یوں محسوس ہوا جیسے ایک بڑا بھیانک شعلہ اوپر سے ٹوٹ کر زمین کی طرف آگرا ہو۔ لیکن۔ لیکن .... اندازے کے مطابق وہ بجائے پانی میں گرنے کے زمین پر آرہا۔ اور زمین پر گرتے ہی ایک بھیانک چیخ فضا میں بلند ہوئی اور دوسرے لمحہ اس نے تڑپ کر دم توڑ دیا۔

یہ منظر دیکھ کر اس کی بیوی بے تحاشا اس کی طرف دوڑی لیکن .... گھبراہٹ میں وہ گڑھے سے اٹھتے ہوئے شعلوں میں بچے سمیت جا گری۔ ایک لمحہ میں یہ سب کچھ ہو گیا بہت سے آدمی بالنسوں کے حصار کو پھلانگ کر اندر کود پڑے۔ بڑی مشکل سے آگ پر قابو پا کر ان تینوں کو نکالا گیا۔ لیکن وہ دونوں بھی اس کی طرح جل کر دم توڑ چکے تھے۔ تین انسانوں کی لاشیں آگ سے جل چکی تھیں اور جلے ہوئے گوشت کی بو فضا میں عجیب قسم کا تاثر پیدا کر رہی تھی۔

چند لمحوں میں یہ خبر آگ کی طرح ساری نمائش میں پھیل گئی۔ سرکس بازار بند کر دیا گیا اور ساری نمائش بند کر دی گئی۔

چند گھنٹوں بعد سرکس بازار سے تین جنازے قبرستان لیے جا رہے

تھے۔ ایک عورت کا۔ ایک مرد کا اور ایک معصوم بچّی کا۔

ہر طرف گہرا سناٹا پھیلا ہوا تھا۔ جنازوں کے پیچھے، سرکس کے مسخرے تھے، سرکس کا مالک تھا، اور سرکس کا سارا اسٹاف تھا۔

میں بھی سر جھکائے سب لوگوں کے ساتھ چل رہا تھا۔ مجھے اس کے وہ جملے یاد آرہے تھے جو چند گھنٹوں پہلے اس نے مجھ سے کہے تھے۔ لیکن آج موت نے اسے شکست دے دی تھی۔ اور جب ...... تینوں جنازوں کو سپردِ خاک کیا جانے لگا... تو اچانک میرا دل چاہا کہ میں اس کے منہ سے کفن ہٹا کر اس سے کہوں،

"تم نے پیٹ بھرنے کی خاطر موت سے کیوں جنگ چھیڑ رکھی تھی میرے دوست! زندگی اتنی ارزاں تو نہیں جسے پیٹ کی خاطر یوں سرِ بازار موت کے حوالے کر دیا جائے۔"

لیکن یہ سب سوچتے ہوئے بھی میں اس سے کچھ نہ کہہ سکا اور پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔!"
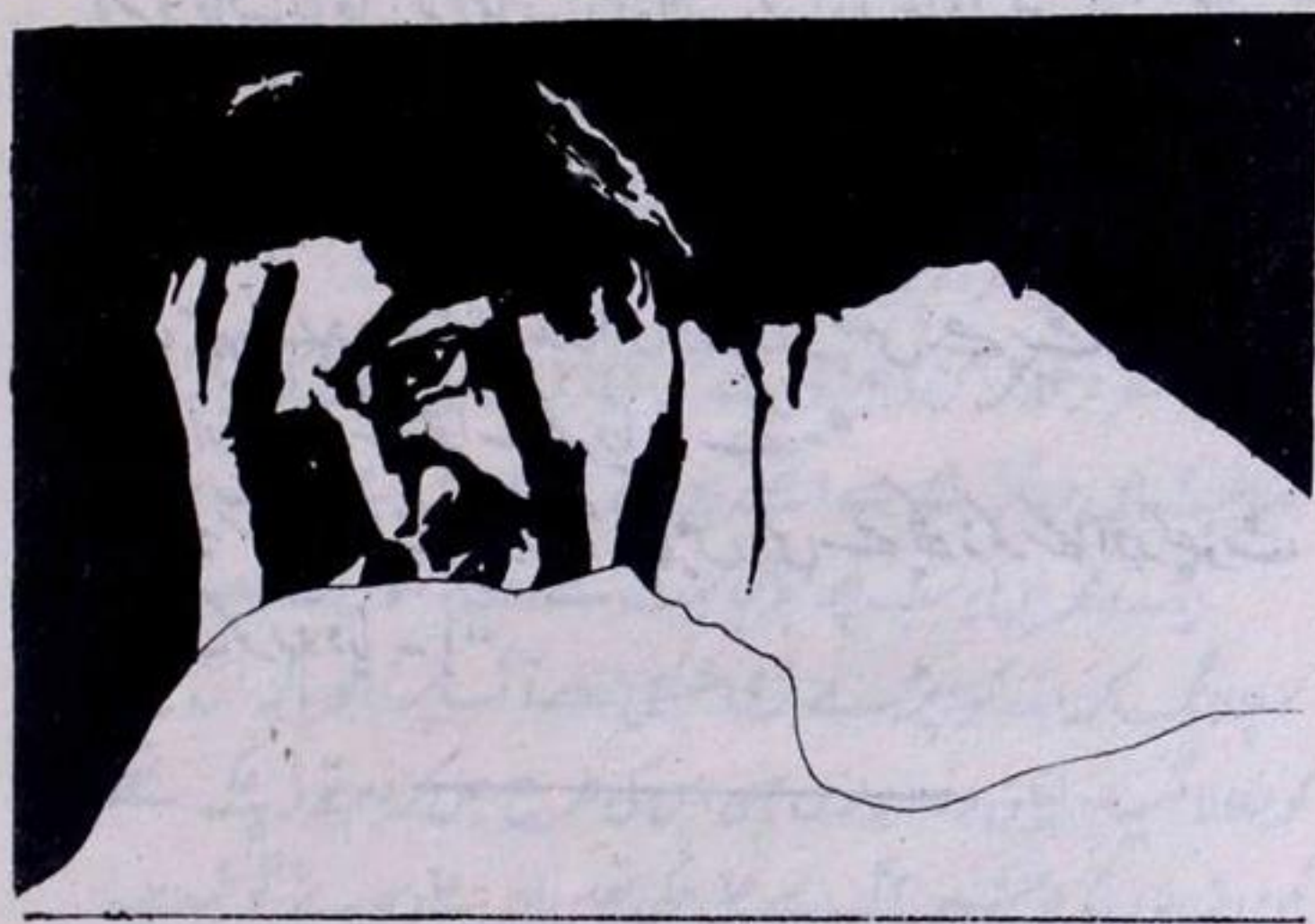
”۔ ایک ایسے شخص کا افسانہ جو اپنی محبت
کو حاصل کرنے کے لیے تاجر بننا چاہتا تھا، مگر جب
اسے ہوش آیا تو وہ تاجر کی بجائے ایک بڑا دلال بن
چکا تھا۔ اس کی محبوبہ غبار بن کر ہواؤں میں
گم ہو چکی تھی۔ اور ایک دن اس نے اپنی انا کو بچانے کے
لیے اپنی بیٹی کو بھی داؤ پر لگا دیا۔“

آخری گاھک

جمال دین اس علاقے کا سب سے بڑا دلال تھا۔ زندگی میں بعض حادثات ایسے بھی ہوتے ہیں کہ وہ ہو گزرتے ہیں اور آدمی کو ان کا احساس بھی نہیں ہوتا۔ آدمی بننا کچھ چاہتا ہے اور حالات اسے کچھ بنا دیتے ہیں۔

ہر انسان میں کچھ ایسی مخفی قوتیں پوشیدہ ہوتی ہیں کہ اسے ان کا علم بھی نہیں ہوتا۔ جمال دین تاجر بننا چاہتا تھا کہ وہ جس لڑکی سے محبت کرتا تھا، وہ خواب زدہ تھی اور روپیہ اس کی زندگی میں بہت اہمیت رکھتا تھا۔ کیونکہ روپے سے انسان اپنے خوابوں کو بھی خرید سکتا ہے اور انہیں زندگی دے کر اپنے ڈرائنگ روم میں سجا سکتا ہے۔

لیکن اس سے پہلے کہ جمال دین تاجر بنتا اس کی محبوبہ کو ایک اور تاجر بھاگیا اور جمال دین خوابوں کی جستجو میں دیوانہ وار دوڑتے دوڑتے خود سراب بن گیا (خوابوں کو بھلا کس نے گرفت کیا ہے؟)۔

جب اسے ہوش آیا تو وہ تاجر کے بجائے عورتوں کا دلال بن چکا تھا۔ اور — اور اب وہ اس علاقے کا سب سے باکمال دلال تھا۔ اچھا دلال بننے کے لیے بنیا بننا بہت ضروری ہے اور بنیا اپنی دوکان پر آئے ہوئے کسی گاہک کو اور کسی دکان پر نہیں جانے دیتا اور بڑی خوبصورتی سے اس کی

کھال اتار لیتا ہے۔
اور اب تو جمال دین اپنے دھندے میں اس حد تک منجھ گیا تھا کہ چاہے گاہک کسی بھی حیثیت کا کیوں نہ ہو وہ اسے بھوکی بلی کی طرح دبوچ لیا کرتا اور ایک بار تفریح کی غرض سے آنے والا گاہک ہمیشہ اس کا اسیر ہو رہتا۔
جمال دین اس علاقے کا سب سے بڑا دلال ہی نہیں تھا بلکہ وہ اس علاقے کا سب سے بڑا تاجر بھی تھا۔ دراصل اب وہ پرانا جمال دین نہیں رہا تھا۔ بلکہ اس کے اندر کا جمال دین جو صرف ایک تاجر تھا اس کی شخصیت کو توڑ کر باہر نکل آیا تھا۔ اسے عورتوں سے نفرت تھی، کیونکہ عورت اس کی سب سے بڑی محرومی تھی۔ اور عورت نے ہی اسے ایک ایسا گہرا زخم دیا تھا جو رستے رستے اب ناسور کی شکل اختیار کر چکا تھا۔ مگر عورتوں سے نفرت کے باوجود بھی وہ عورتوں کا کاروبار کرتا تھا۔
چوبیس سال کے طویل عرصے میں اس کاروبار کے ذریعے اس نے بے انتہا دولت کمائی تھی سرمایہ داروں کی محفل میں اس کی بڑی عزت تھی۔ دراصل عزت اس کی نہیں بلکہ اس کے مال کی تھی، اس کے اصولوں کی تھی، اس کے رسوخ کی تھی جو لڑکیاں سپلائی کر کے اس نے سماج میں اپنے لیے حاصل کیے تھے۔ اس لیے آج وہ بہت بڑا دلال تھا۔
جمال دین ہی کیا دنیا کا ہر انسان دلال ہے، کوئی اپنے فن کی دلالی کرتا ہے اور کوئی اپنے ضمیر کی دلالی، اور کوئی اپنی عزت کی دلالی کرتا ہے۔ دراصل بغیر دلالی کیے ہوئے کوئی بھی انسان اپنے لیے سماج اور معاشرے میں جگہ نہیں بنا سکتا۔ اور معاشرے میں جگہ بنانا ضروری ہے۔ کیونکہ بغیر جگہ بنائے ہوئے آدمی صرف "مزدور" کہلاتا ہے۔ اور مزدور اس سرمایہ دارانہ

دور کی سب سے بڑی لعنت ہے۔

جمال دین کے پاس اپنی گاڑی تھی، اپنا بنگلہ تھا، اپنی بیوی تھی اور اپنی بیوی سے اس کے اپنے بچے تھے۔ اور اب وہ معاشرے کا ایک بااثر شخص تھا، کیونکہ دولت اس کے پاس تھی۔

مگر آج کی رات اس کی زندگی میں ایک ہل چل لیے آئی تھی۔

اور آج اسے زندگی کی سب سے پہلی شکست کا احساس ہو رہا تھا۔ شکست تو اس نے اپنی زندگی کے پہلے حصے میں بھی کھائی تھی اور وہ شکست اسے ایک خوبصورت عورت نے دی تھی۔ جو اس کی محبوبہ تھی اور جو غبار بن کر فضا میں بکھر چکی تھی۔ مگر اس شکست سے زیادہ اسے آج کی شکست کا احساس ہو رہا تھا۔

رات کا ایک بج رہا تھا اور وہ سرخ رنگ کی نئی لمبی سی کار میں شہر کے سب سے بڑے سرمایہ دار کے پہلو میں بیٹھا بے دردی سے سگریٹ پہ سگریٹ پھونک رہا تھا۔

یہ سیٹھ ایک نیا دولتیہ تھا جس کے شہر میں چھ مل تھے جس میں تقریباً سات ہزار مزدور خون پسینہ بہاتے تھے اور مزدوروں کا خون اور پسینہ مل کر اس کی شخصیت پہ چھا گیا تھا، وہ خود بھی سرخ سپید تھا، اکثر سرخ ٹائیاں باندھتا اور سرخ گاڑی میں گھومتا، اس کی کوٹھی کے ڈرائنگ روم کے پردے بھی سرخ تھے، قالین بھی سرخ تھا۔ بہر حال وہ محنت سے بہنے والے خون کی نمائندگی کیا کرتا اور قومی اخبارات میں مزدوروں کی حمایت میں بڑے بڑے بیان دیا کرتا تھا۔ اور جب یہ بیانات اخبار میں شائع ہوتے تو وہ اپنے سرخ ایئر کنڈیشن ڈرائنگ روم میں سرخ

شراب پی کر انہیں پڑھتا اور اتنے قہقہے لگاتا کہ اس کی آنکھوں میں سرخ آنسو بہنے لگتے۔ اور آج وہ جمال دین کا گاہک تھا۔ جمال دین جو سیٹھ بھی تھا، دلال بھی اور گلو بھائی جو مل اونر بھی تھا اور دلال بھی۔ دراصل اس رات دو بڑے دلالوں کا ٹکراؤ تھا اور وہ دونوں ایک دوسرے سے سفاکی میں سبقت لے جانا چاہتے تھے۔

گلو بھائی چھ ملوں کا مالک تھا جس کے ملوں میں سات ہزار مزدور خون پسینہ بہاتے تھے اور اس کی انا کی تسکین کے لیے یہ بات کافی تھی۔ جمال دین صرف خوبصورت عورتوں کا کاروبار کرتا تھا کیونکہ ایک خوبصورت عورت نے اس انا کو زخمی کیا تھا۔

رات کا توازن برابر بکھر رہا تھا مگر گلو بھائی عرف پانی والا کو انیس خوبصورت لڑکیوں میں سے ایک لڑکی بھی پسند نہ آئی تھی جس کے ساتھ وہ آج کی رات گزار سکتا۔

سڑک سنسان ویران پڑی تھی۔ اکا دکا گاڑیاں سڑک پر بہہ رہی تھیں اور رات کا توازن برابر بکھر رہا تھا۔ کیا گلو بھائی مجھے شکست دے دے گا۔؟ گلو بھائی کے قریب بیٹھا ہوا جمال دین پہلو بدل کر سوچ رہا تھا۔ زندگی کی ایک بڑی اور پہلی شکست نے اسے کیا بنا دیا تھا اور اس چوٹ کو کھا کر اس نے زندگی کے ہر پہلو کو شکست دی تھی۔ مگر کیا آج کی رات اس کی عمر بھر کی ساکھ کو مٹی میں ملا دے گی۔ یکایک اسے گلو بھائی کے وہ الفاظ یاد آئے جو اس نے ہر لڑکی کو گہری نظروں سے پرکھنے کے بعد کہے تھے، "ہم ایک دم فرسٹ کلاس مال مانگتا۔ رپے کی پرواہ مت کرو۔ ہم آج بہت ہی خوبصورت لڑکی سے دل بہلانا مانگتا جس کی کمر غالب کے محبوب

کی موانگ ہو - اور کون تھا اپنا ہاں! سمجھ میں آتا ہے میٹر آنکھیں اس کے محبوب کے موانگ ۔شکل مدھو بالا جیسی - !

”میں اپنے گاہک کو نہیں جانے دوں گا - یس، میں اسے آج رات ہر صورت علیش مہیا کروں گا - ” وہ ہانپنے لگا پھر پوری قوت سے چیخا، ” تمہیں ایسی لڑکی چاہیے - تمہیں ایسی ہی لڑکی ملے گی گاڑی واپس لوٹاؤ - !“

(یہ آواز جمال دین کی نہیں تھی - پھر اتنی زور سے کون چیخا تھا؟)

گلو بھائی نے چونک کر جمال دین کی طرف دیکھا اور قہقہہ لگا کر بولا، ”بالکل بالکل بالکل اب سالا تم ہمارا مطلبت سمجھا - اگر تمہارے پاس مال ہے تو اپن کے پاس اس کی قیمت موجود ہے -“

رات کے دو بجے تھے - ایک خوبصورت بنگلے کے سامنے سرخ گاڑی رکی، پہلے جمال دین اترا، پھر دوسری طرف سے سیٹھ گلو اترا - جمال دین خاموشی سے چلتا ہوا دروازے تک گیا - سیٹھ موقعہ کی نزاکت کو بھانپ گیا اور وہ کچھ دور ہی کھڑا ہو گیا - چند لمحوں بعد ہارے ہوئے جواری کی طرح جمال دین نے بیل پر ہاتھ رکھ دیا - چند منٹوں بعد دروازہ کھلا اور ایک بیس سالہ خوبصورت لڑکی سیلپنگ گون میں لپٹی ہوئی نمودار ہوئی اس کی آنکھیں نیند سے بوجھل تھیں - جمال دین لڑکی کو دیکھتے ہی بری طرح سے ہانپنے لگا -

مگر سیٹھ گلو بھائی بے تابی سے آگے بڑھ کر بولا، ” بالکل فٹ - بالکل ہم ایسا ہی مال مانگتا - آج ہم بہت خوش ہیں جمال دین - یہ لو اپنی محنت کا پھل۔“ یہ کہہ کر سیٹھ گلو نے ریپوں سے بھرا ہوا پرس جمال دین کی طرف لاپرواہی سے اچھال دیا -

دروزاہ بند ہو چکا تھا - جمال دین کی سامنے سو سو روپے کے بے انتہاد

نوٹ پڑے تھے۔ مگر آج ان نوٹوں میں کوئی جاذبیت نہیں تھی، کیونکہ اس کے ذہن میں لڑکی کی گھٹی گھٹی سی چیخیں گونج رہی تھیں ۔۔ "بابا ! مجھے ۔ مجھے بچالو بابا ۔ بابا"

"۔۔۔ دو دھڑکتے دلوں کی ایک نرم و نازک کہانی،
جن کے قدموں میں زندگی نے خوشیاں ڈھیر کرنا چاہیں
مگر انہوں نے محبت کو فرض پر قربان کر دیا۔ پھر
محبت کو پانے کے لیے انتظار ان کا رقیب بن گیا، ۔ ایک طویل
انتظار کے بعد آخر۔۔۔"

سوکھے پتے

علی رضا نے سگار ایک گہرا کش کھینچا اور بیتابی سے ہاتھ پر بندھی ہوئی گھڑی کو دیکھا۔ ابھی صبح کے نو بجے تھے اور اسے تین گھنٹے انتظار کی طویل گھڑیاں کاٹنی تھیں!

"ٹھیک بارہ بجے وہ جیسے اپنے آپ سے بولا۔" وہ ضرور آئے گی"۔

جب انسان تنہا ہوتا ہے اور انتظار کی کرب انگیزیوں سے اپنے وجود کو بچانا چاہتا ہے تو وہ خود بخود دو حصوں میں تقسیم ہو جاتا ہے۔ علی رضا سگار کے گہرے کش کھینچ رہا تھا اور اس کا اپنا آپا اس کے سامنے پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھا ہوا کہہ رہا تھا، علی رضا پچاس سال کا عرصہ بڑا طویل ہوتا ہے۔

تم بھی کس قدر معصوم ہو۔ کون جانے اسے کچھ ہو گیا ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ اس وقت اپنے بوڑھے شوہر کے لیے ڈاکٹر سے دوائیں لینے گئی ہو۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ تمہیں ایک خواب سمجھ کر بھول بیٹھی ہو۔ نہیں نہیں۔ وہ ضرور آئے گی اسے کچھ نہیں ہو سکتا میں جانتا ہوں وہ ضرور آئے گی"۔ علی رضا بے تابی سے اور گہرے کش کھینچنے لگا۔ اور اس کے سامنے بیٹھا ہوا اس کا آپا زور زور سے قہقہے لگا لینا لگا۔

علی رضا نے کوٹ کی جیب سے ایک لفافہ نکالا اسے کھولا پھر اس کے اندر دو موٹے کاغذوں میں لپٹی ہوئی الونیا کی تصویر کو نکالا اور بڑے غور سے تصویر کو دیکھنے لگا۔

۔آج سے تیس سال پہلے کی الونیا کی تصویر دیکھ کر اس نے سگار کا ایک تلخ گھونٹ کھینچا اور اس جگہ جا پہنچا جہاں وہ تھا الونیا تھی ۔اس کی جوانی تھی۔ اور وقت کی حسین دہلیز پر ان دونوں کی یادوں کے انمٹ نشان !

" وہ تیس سال کا بھرپور مرد تھا اور الونیا پچیس سال کی ایک حسین سی زرمل زرمل سی لڑکی ۔ اور وہ ایک دوسرے کو بے پناہ چاہتے ہوئے بھی شادی نہ کر سکے تھے ۔ زندگی کے بعض معمولی معمولی سی باتیں معمولی ہو کر بھی ایسے انتہا گہری اور بے انتہا وسیع ہوتی ہیں ۔ بات بالکل معمولی تھی مگر اہم بھی !

ایک دن ابر چھایا ہوا تھا ۔ اور گھٹائیں جھوم رہی تھیں ، علی رضا الونیا کے ساتھ اسی ہوٹل میں مشرقی کھڑکی کے سامنے بچھی ہوئی کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس وقت وہ بہت سنجیدہ تھا ۔ وہ چاہتا تھا کہ الونیا شادی کے لیے رضامندی ظاہر کر دے تاکہ اگلے ماہ وہ دونوں شادی رچا کر پرسکون زندگی گزار سکیں ۔ لیکن الونیا شادی کے لیے تیار نہ تھی وہ بڑے فلسفیانہ لہجے میں اسے سمجھا رہی تھی"

" علی! میرا دل بھی یہی چاہتا ہے لیکن تم سوچو تو میری ایک ماں ہے اور تین بہنیں اگر میں شادی کر لوں تو ان سب کا کیا ہے گا ؟ تم جانتے ہو علی میں ان سب کو ماں اور باپ بن کر پال رہی ہوں !"

" ہاں جانتا ہوں ! تم کب تک وقت کی چکی میں اپنے آپ کو پیستی رہوگی ؟ میں نے اپنے مستقبل کے بارے میں بہت سوچا ہے علی ! اور اب تو میں نے حالات کے دھارے میں اپنے آپ کو چھوڑ دیا ہے ۔ اور میں ۔ ہاں میں شادی نہیں کر سکتی !"

" یہ تمہارا آخری فیصلہ ہے الونیا " علی رضا نے گھبرا کر پوچھا ۔"

" ہاں ! علی یہ میرا آخری اور اٹل فیصلہ ہے ۔ الونیا نے اعتماد سے کہا اور یہ سب سن کر

علی رضا جذباتی ہوگیا تھا وہ لڑکیوں کی طرح سسک سسک کر رو رہا تھا۔!

باہر آسمان کی وسعت پر بادل منڈلا رہے تھے اور ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی۔ اور اندر مشرقی کھڑکی کے سامنے پڑی ہوئی کرسیوں پر بیٹھے علی رضا اور الونیا بھی بادلوں کی طرح رو رہے تھے۔ یہ کیسی ٹریجڈی تھی۔؟ سب کچھ ممکن تھا پر کچھ نہیں۔؟ وہ ایک دوسرے کو بے پناہ چاہتے تھے اور شادی بھی کر سکتے تھے۔ پر شادی نہیں ہو سکتی تھی کیونکہ الونیا چاہتے ہوئے بھی یہ نہیں چاہتی تھی۔

یکایک علی رضا بھرائی ہوئی آواز میں جذباتی ہو کر بولا، "پر تم مجھے کیوں ملتی تھیں۔ الونیا۔ آخر کیوں؟ تم نے چاہت کا اظہار کیوں کیا تھا۔ اور میں تم سے کیوں محبت کرنے لگا!؟" یہ کہہ کر وہ خاموش ہوگیا۔ تھوڑی دیر وہ دونوں خاموش بیٹھے رہے جیسے جیسے اپنے اپنے جسموں کو کرسیوں پر بیٹھا چھوڑ کر کہیں دور چلے گئے ہوں۔!

دور کہیں سے الونیا کی آواز ابھری۔ "علی! میں مجبور ہوں علی۔ ہیں علی تم خاموش کیوں ہو۔ مجھے معاف کر دو علی۔!" پر علی خاموش تھا۔ دوسرے لمحہ الونیا رو رہی تھی اور علی کہہ رہا تھا۔

الونیا! مجھے اس بات کا دکھ ضرور ہے کہ ہم شادی نہیں کر سکیں گے لیکن ساتھ ہی مجھے اس بات کی بے انتہا خوشی ہے کہ تمہارے اندر عظمت ہے تم بہت عظیم ہو۔ سچ دوسروں کے لیے اپنے ارمانوں کا خون کرنا بڑی بات ہے۔ مجھے فخر ہے اور تمام عمر رہے گا۔ کہ میں نے ایسی لڑکی سے محبت کی جو عظیم تھی۔"

"نہیں علی! مجھے اتنا بڑا نہ سمجھو، میری اتنی تعریف نہ کرو کہ میں اسے برداشت نہ کر سکوں!" اور اس لمحے علی رضا نے بے چین ہو کر سگریٹ سلگایا۔ اور دھواں بکھیرتا ہوا بولا،

"میں تمہارا صدیوں انتظار کر سکتا ہوں۔ تم اس بارے میں پھر سوچو۔"

"سب مرد ایسی باتیں کرتے ہیں۔" الونیا نے شرارت سے کہا۔

یہ سن کر علی رضا جذباتی ہو گیا۔ "الونیا میں عام مرد نہیں ہوں۔ میں تمہارا صدیوں منتظر رہوں گا۔ پر یہ باتیں تو کتابی ہیں، صدیوں نہ تم زندہ رہو گی اور نہ میں۔"

"ہم لوگ آج سے ایک دوسرے سے بالکل نہیں ملیں گے اور آج سے پچاس سال بعد اسی تاریخ، اسی مہینے اور اسی وقت اسی جگہ میں تمہاری منتظر رہوں گی۔ تم آؤ گے نا۔ علی رضا؟"

علی رضا نے گہری نظروں سے الونیا کو گھبرا کر دیکھا "یہ لڑکی ایک معمہ ہے" اس نے سوچا۔

"تم جو کچھ کہتی ہو مجھے منظور ہے۔ یہ کہہ کر اس نے ایک گہرا سانس لیا اور بے تابی سے کھڑا ہو گیا۔ اب ہمیں چلنا چاہیئے، دونوں کھڑے ہو گئے ان کے دل دھڑک رہے تھے، چہرے زرد تھے اور لب خاموش پر آنکھیں بھیگ چکی تھیں وہ ایک دوسرے کو دلاسے دے رہی تھیں۔ الونیا جانتی تھی علی رضا بے انتہا ضدی ہے۔ اور علی جانتا تھا کہ الونیا جذباتی لڑکی ہے۔ باہر نکل کر علی رضا نے الونیا کو ایسی نظروں سے دیکھا جیسے کہہ رہا ہو "پگلی اب بھی بڑھ کر مجھے روک لو۔ میں اڑتا ہوا بادل ہوں جو لمحہ بھر میں برس کر پگھل جاتا ہے اور نگاہوں سے گم ہو جاتا ہے" لیکن الونیا نے گھبرا کر نظریں جھکا لیں۔ اور علی رضا۔ خدا حافظ کہتا ہوا لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا غائب ہو گیا اور وہ

اسے جاتے ہوئے دیکھ کر کھڑی رہ گئی تھی — اور - اور آج -
وہی تاریخ تھی۔ وہی جگہ تھی۔
پچاس سال کا طویل عرصہ جانے کیسی کیسی اذیتوں تلے کھپ گیا تھا
وقت نے علی رضا کو ۸۰ سالہ بوڑھے کے روپ میں بدل دیا تھا - اور
آج وہ حسب وعدہ اپنی محبوبہ کا منتظر تھا وہ سوچ رہا تھا "الونیا۔ آہستگی
سے چلتے ہوئے آئے گی، اور اس کے قریب کھڑے ہو کر سرگوشی میں کہے
گی، واقعی علی تم عام مرد نہیں ہو۔ تم بہت عظیم ہو، آج تمہیں پاکر مجھے یوں
محسوس ہو رہا ہے جیسے وقت کا حسین دھارا ایک بار پھر پیچھے کی طرف
دوڑ پڑا ہے "۔ علی سوچ رہا تھا۔ سگار کے گہرے گہرے کش کھینچ رہا تھا
اور کھانستے کھانستے مسکرا رہا تھا اور جب سگار کے گہرے گہرے کش کھینچتے ہوئے
وہ بے دم ہو گیا تو اس نے اپنا سر میز پر ٹیک دیا - اور آنکھیں موند لیں - اور
ایک بار پھر وہ تھا - الونیا تھی - اور پچاس سال پہلے کی جوان یادیں۔ تصورات
کی مکڑی اپنے تانے بانے تیزی سے بننے لگیں -
ٹھیک بارہ بجے - ایک بوڑھی عورت ہانپتی ہوئی اندر آئی اس کی نگاہیں
بے تابی سے مشرقی کھڑکی کے سامنے بچھی ہوئی کرسی پر بیٹھے ہوئے بوڑھے
پر جا پڑیں اور وہ بے انتہا خوشیاں سنبھالتی ہوئی بوڑھے کے قریب جاکر کھڑی
ہو گئی۔ اور پھر بڑی جذباتی انداز میں بولی،
"علی! میرے علی! تمہاری الونیا آ گئی جس کے تم منتظر تھے -"
لیکن بوڑھا یوں ہی میز پر سر ٹیکے اطمینان سے پڑا رہا بوڑھی عورت جذبات
سے مغلوب ہو کر پھر دھاڑی - "کیا تم مجھ سے ناراض ہو علی! میں نے تمہیں بہت
دکھ دیا ہے مجھے معاف کر دو - علی! میری طرف دیکھو - تم کیا جانو اتنا طویل عرصہ

تم بتاؤ میں نے کس طرح گزارا ہے، لیکن بوڑھا یوں ہی خاموش رہا جیسے سب کچھ سن رہا ہو۔ اور دوسرے لمحے بوڑھی عورت نے جذباتی ہو کر علی کی گردن میں اپنی باہنیں ڈال دیں لیکن لیکن علی رضا ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خاموش ہو چکا تھا۔

"مذہب کے نام پر خدا کی زمین پر فساد
کرنے والے ان لوگوں کا قصہ جنہوں نے ہندوستان
میں ایک سادھو اور پاکستان میں ایک مولوی کو
قتل کر دیا اور دو بے گناہ انسانوں کے قاتلوں کو یہ
بھی پتہ نہ چل سکا کہ دراصل یہ ان کی اپنی
موت تھی۔"

گولر کا پیڑ

گولر کا پیڑ
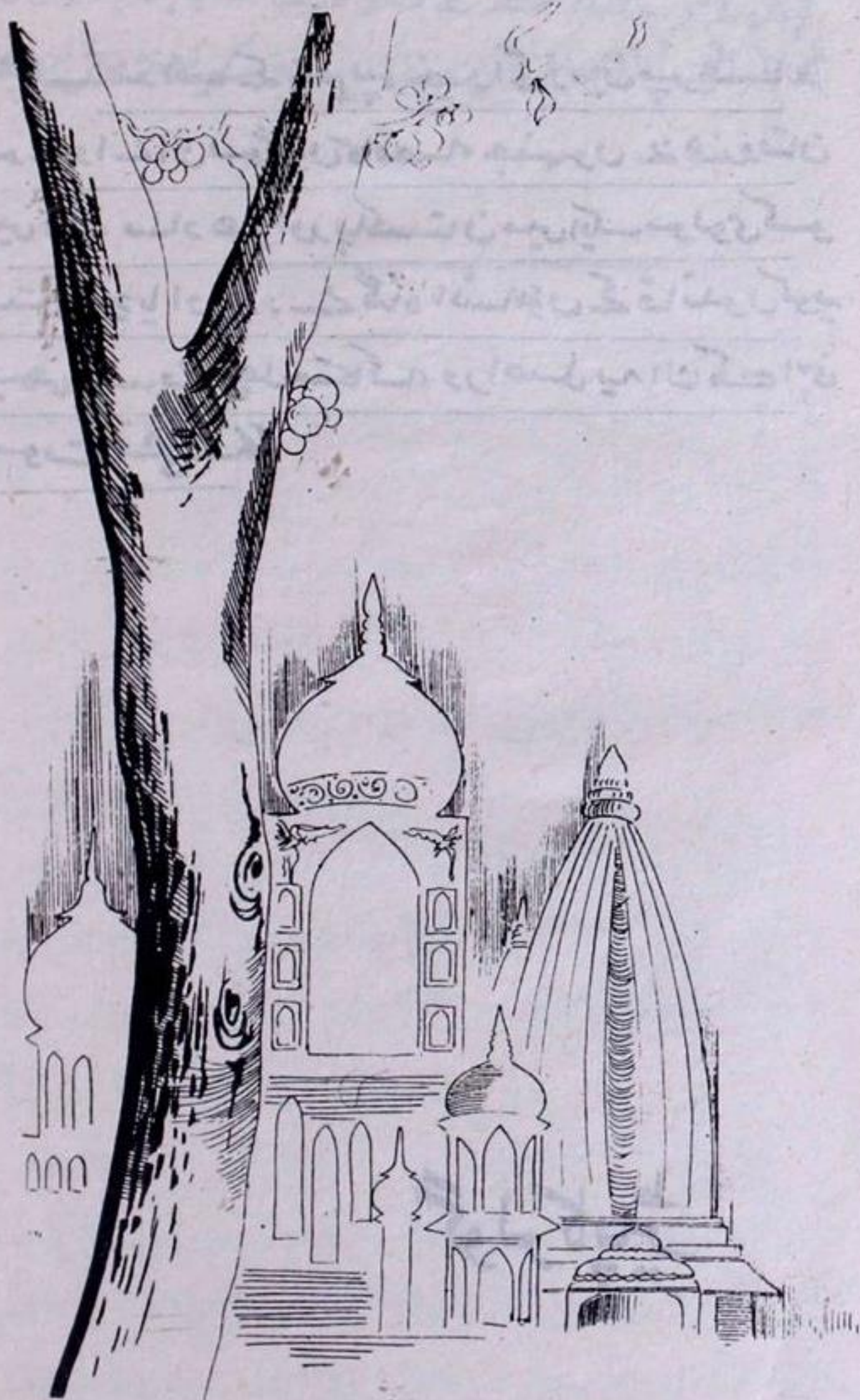
مجھے بچپن میں گول گول، لال لال، میٹھے میٹھے گولر بہت پسند تھے۔ شہر سے دور جب صبح سویرے میں اپنے دوست آفتاب کے ساتھ اسکول جایا کرتا تو اکثر ہم دونوں جانے کہاں کہاں کی بے تکی بے تکی سی باتیں کرتے رہتے، لیکن تان آخر گولر کے اس پیڑ پر جاکر ٹوٹتی جو ہمارے اسکول کے سامنے ٹیلے کے پیچھے، مسجد کے بالکل نزدیک کھڑا تھا۔

گولر کا پیڑ۔ جس پر موٹے موٹے، گول گول، لال لال گولر ٹنگے رہتے۔ بچپن میں مجھے جتنے گولر پسند تھے، اتنی ہی ماسٹر یاسین، جو ہمیں حساب پڑھاتے تھے، ان سے چڑ سی تھی۔ گولر کتنے میٹھے ہوتے ہیں اور مار کا مزہ کس قدر تلخ ہوتا ہے۔

اکثر میں اور میرا دوست ماسٹر لیسین صاحب کے ڈر سے حساب کا گھنٹہ گول کر جاتے، اسکول کے گیٹ سے نکلتے وقت ہم سوچتے، "اگر وقت سے پہلے ہم لوگ گھر پہنچے تو گھر کے لوگ پوچھیں گے، اتنی جلدی کیوں چلے آئے؟ اس سوال کا جواب ہم کچھ اس طرح حل کرتے، میں کہتا، "یار آفتاب ٹیلے پر چلتے ہیں، وہاں سے سارا علی گڑھ دکھائی دیتا ہے اور اوپر کوٹ کا تو ایک ایک گھر صاف دکھائی دیتا ہے۔"

آفتاب مجھ سے کہتا! "یار نہیں! تو بھی کتنا پاگل ہے، اونچے ٹیلے سے اسکول اور اسکول سے اونچا ٹیلہ صاف دکھائی دیتا ہے، اور اونچے ٹیلے کی ہر

چھوٹی بڑی چیز۔ اگر ماسٹر لیسن صاحب نے دیکھ لیا یا کسی لڑکے نے شکایت کر دی، تب کیا ہوگا۔؟"

"چلو یار آج تو گولر کھانے چلتے ہیں۔" میں لہک کر کہتا۔

"ہاں! ہاں! یہ ٹھیک ہے، گولر کھاتے ہیں،" آفتاب کے منہ میں بھی پانی بھر آتا۔ پھر ہم اونچے ٹیلے کے پیچھے گولر کے پیڑ تک جا پہنچتے۔

"سنو! میں اوپر جاکر گولر توڑ توڑ کر نیچے گراتا ہوں، تم جمع کرتے رہنا۔ تب اکٹھے بیٹھ کر گولر کھائیں گے۔ میں پیڑ پر چڑھتے چڑھتے آفتاب سے کہتا۔"

پھر میں ایک ایک ڈالی چھان مارتا اور آفتاب مسجد کے صحن میں دھوپ کی تمازت سے بچتا پیڑ سے گرتے ہوئے گولر اپنی گود میں بھرتا۔ تب میں اترتا مسجد کے صحن میں بیٹھ کر ہم لوگ گولر کھاتے۔

اسکول کی گھنٹی بجنے کی آواز یہاں تک صاف سنائی دیتی، جب گھنٹی بجتی اور لڑکے بائے اسکول سے شور وغل مچاتے، ایک دوسرے کو چھیڑتے سڑک پر نکل آتے تو ہم دونوں بھی ان میں اس طرح شامل ہو جاتے جیسے اسکول سے پڑھ کر نکلے ہوں۔

ایک دن یوں ہی گولر کھاتے کھاتے میں نے آفتاب سے پوچھا "یہ مسجد ویران کیوں پڑی ہے؟ یہاں کوئی نمازی نماز پڑھنے کیوں نہیں آتا؟"

آفتاب نے میری طرف اس طرح دیکھا جیسے اچانک اسے کچھ یاد آگیا۔

"آؤ۔ آؤ چلتے ہیں۔ چلو مجھے تو یاد ہی نہیں رہا" ۔ وہ کسی انجانے خوف سے سہم کر بولا۔

"کیا بات ہے، بھئی بتاؤ تو سہی ۔" میں نے گھبرا کر پوچھا۔

"تم نکلو تو سہی ۔ جلدی کرو"۔ آفتاب لرزنے لگا۔

"کیا بات ہے آفتاب؟ تم اس قدر پریشان کیوں ہو گئے، کچھ بولو بھی" میں نے کہا۔ اور جب ہم لوگ گولر کے پیڑ اور مسجد سے کافی دور سڑک پر چلے آئے تو آفتاب نے کہا "مجھے تو بالکل یاد نہیں رہا تھا۔ اف۔!"

"مجھے بھی کچھ بتاؤ گے یا یوں ہی کہے جاؤ گے۔" میں نے جل کر کہا۔

"بھئی سنا تو رہا ہوں۔ سنو تو سہی" "کسی زمانے میں یہاں مسجد کے آس پاس کچھ مسلمان کسان آباد تھے۔ انہیں کے دم سے یہ مسجد آباد تھی۔ وہی لوگ مسجد کے مولانا کو پیسے دیا کرتے تھے، لیکن جب ۱۹۴۷ء کا فساد ہوا تھا تو سنتے ہیں یہاں کے مسلمان کچھ مرے، کچھ مٹے اور کچھ جان بچا کر پاکستان بھاگ گئے لیکن بیچارے مولانا جب رات کو گہری نیند سو رہے تھے تو کسی ہندو نے انہیں سوتے میں قتل کر دیا۔ اسی دن سے سمجھو یہ مسجد اجڑ گئی، ویران ہو گئی۔" آفتاب کسی انجانے خوف سے کانپتا ہوا بولا۔ "اب اکثر ان مولانا کی روح مسجد میں بھٹکتی پھرتی ہے۔"

ابھی مجھے ہندوستان سے آئے ہوئے ایک طویل عرصہ نہیں گزرا۔ پاکستان آکر میں نے دیکھا کہ جو کچھ ہندوستان میں ہوتا ہے وہی یہاں بھی ہے۔ ہندوستان میں آج بھی مسلمان موجود ہیں اور پاکستان میں آج بھی ہندو بستے ہیں۔ علی گڑھ میں محمد علی روڈ تھی اور یہاں حیدر آباد میں تلک چاڑی روڈ آج بھی موجود ہے۔ محمد علی روڈ پر مسلمان محلہ آباد ہے اور تلک چاڑی روڈ پر ہیر آباد۔ ہیر آباد کے نیچے اتار ہے اور اتار سے ایک نئی بستی بیراج کالونی آباد ہے۔ ہیر آباد اور نئی بستی کے درمیان ایک قدیم مندر کھڑا ہے۔

میں روز ہی اوپر سے نیچے اور نیچے سے اوپر آتا جاتا ہوں جب پہلی بار میں نے یہ مندر دیکھا تو اچانک مجھے علی گڑھ سے دور ٹیلے کے پیچھے گولر کے درخت

کے نزدیک والی وہ ویران مسجد یاد آگئی، جہاں بچپن میں میں اور میرا دوست گولر کھاتے تھے۔ یادوں کے پھول کس قدر حسین ہوتے ہیں۔ آفتاب وقت کے دھارے میں بہہ کر جانے کدھر چلا گیا۔ لیکن اب میرا دوست دفتر کا ایک ساتھی ہے۔ ہم دونوں ساتھ ہی ساتھ دفتر آتے جاتے ہیں۔ یوں ہی جاتے جاتے ایک دن میرے دفتر کے ساتھی اختر نے کہا، "یہ جو مندر ہے نا جسے تم دیکھ رہے ہو؟"

"ہاں! ہاں! کس قدر قدیم مندر ہے۔" میں نے کہا۔

"رات کے وقت اس میں عجیب عجیب سی ڈراؤنی آوازیں گونجتی ہیں۔" ایک انجانے سے خوف سے میرا دوست کانپتے ہوئے بولا۔

"آوازیں؟" "کیسی آوازیں؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"یہ بھی ایک داستان ہے، کہتے ہیں کہ ۱۹۴۷ء سے پہلے یہاں ہندو محلہ آباد تھا، یہ مندر ان ہی نے بنوایا تھا۔ اس مندر کے اندر ایک بوڑھا سادھو رہا کرتا تھا۔ جب ۱۹۴۷ء کے فسادات ہوئے تھے نہ جانے کس نے اس سادھو کو مندر میں قتل کر دیا تھا۔ جب ہی سے یہ مندر ویران ہو گیا۔ اب یہاں رات کے اندھیروں میں عجیب عجیب سی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔"

کبھی کبھی سوتے سوتے، جاگتے جاگتے میں سوچتا ہوں؟ کیا مندر بھی کبھی اجڑ سکتا ہے؟ کیا کوئی مسجد بھی کبھی ویران ہو سکتی ہے؟ دور کہیں دور سے آواز آتی ہے جیسے میرا آپا دور کہیں بیٹھا مجھ سے کہہ رہا ہو۔ "نہ مندر اجڑ سکتا ہے اور نہ ہی مسجد، ہاں! کبھی کبھی یوں ہوتا ہے کہ انسان خود اجڑ جاتا ہے، خود مر جاتا ہے۔"

اور اس لمحہ مجھے کچھ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے گولر کے پیڑ پر کسی لدھی

پدھی سی شاخ پر بیٹھا میں میٹھے میٹھے، لال لال، گول گول، موٹے موٹے گولر کھا رہا ہوں۔"
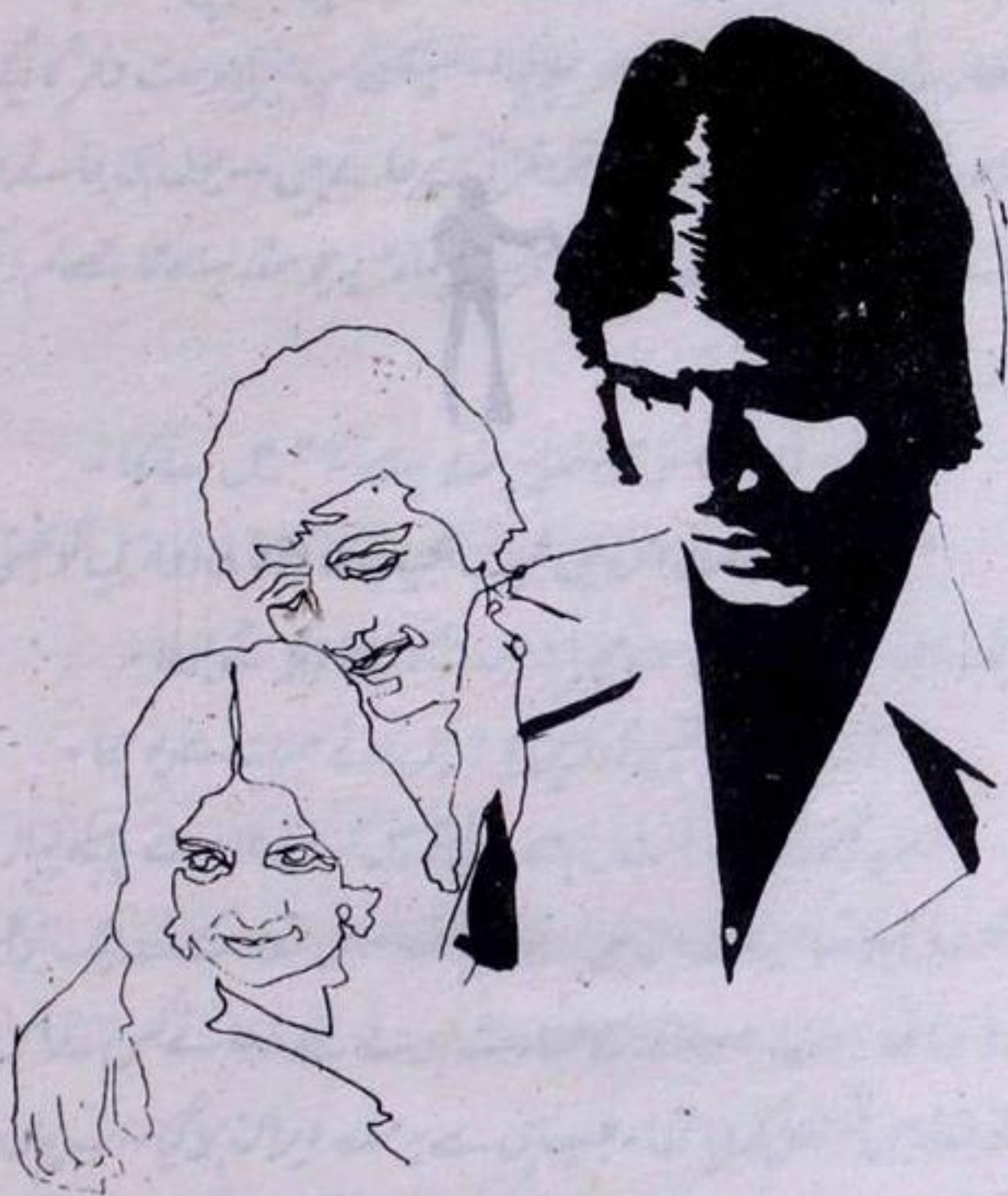
"— ایک ایسے شہر کی کہانی جو "زندہ دلوں" کا شہر کہلاتا ھے — مگر جب وہ اپنے سینے کے زخموں کو دیکھتا ھے تو اس کے آنسوں سے زمین تر ھو جاتی ھے — ھر شہر کے اپنے دکھ، اپنے غم اور اپنی خوشیاں ھوتی ھیں۔ —"

شہر کے آنسو

میں بہت پیاسا تھا۔ دراصل فنکار کی پیاس اس وقت پورے عروج پر ہوتی ہے۔ جب اس کا ذہن زنگ آلودہ ہو چکا ہو۔ اور کافی عرصے سے وہ کوئی نئی تخلیق نہ کر سکا ہو۔ میں کافی عرصہ سے کچھ بھی تو نہ لکھ سکا تھا۔ اور یوں میرا ذہن زنگ آلود ہو گیا۔ اور پھر یوں ہوا کہ میری تخلیقی پیاس اپنی پوری شدت سے چمک اٹھی۔

چاند نیلے شفاف آسمان کی نیلگوں بلندی پر بہکی بہکی چال چل رہا تھا۔ اور میرے قدم انجانی منزل کی طرف بڑھ رہے تھے۔ پھر اچانک میں نے محسوس کیا کہ میں شہر سے دور نکل آیا ہوں۔ تب میں نے گھوم کر شہر کی طرف دیکھا جہاں لاہور برقی قمقموں میں لپٹا ہوا پہلی رات کی دلہن کی طرح للچا رہا تھا۔

میں نے سگریٹ سلگا کر ایک گہرا کش کھینچا اور تھکا تھکا سا ایک کچی قبر کے پاس بیٹھ رہا۔

"مجھے ایک کہانی چاہیئے۔!" میں نے اپنے اندر بیٹھے ہوئے ادیب سے سرگوشی کی۔ "تمہیں کیسی کہانی چاہیئے۔؟" دور کہیں سے ایک آواز آئی!

سگریٹ کا ایک لمبا کش کھینچ کر میں نے سوچا۔ کیا۔ کیا میرے اندر کا ادیب روٹھ کر مجھ سے دور ہو گیا ہے؟ اور دور کہیں سے مجھ سے گویا

ہے ؟ تب میں نے پوری آواز سے کہا، "تم کون ہو۔؟ کہاں ہو؟"
"میں۔ میں تو بالکل تمہارے قریب ہی ہوں دوست۔ بالکل قریب تمہیں
کیسی کہانی چاہیئے؟"

خدارا یہ آواز کیسی ہے۔ یہ اس ویرانے میں کون پُراسرار طور پر
مجھ سے مخاطب ہے۔؟ پھر میں گھبرا کر پوری جان سے چیخا۔ "تم کون
ہو۔؟"

"گھبراؤ نہیں دوست، میں بوڑھا لاہور ہوں۔ جسے تم لوگ زندہ
دلوں کا شہر کہتے ہو۔" آواز بڑی مطمئن تھی۔

میں نے کہا، "تم لاہور ہو۔ زندہ دلاں لاہور۔ میں۔ میں اچھی طرح
جانتا ہوں۔ تمہارے اندر زندگی ہے اور تمہارے دامن میں روز جانے
کتنی رومان انگیز کہانیاں جنم لیتی ہیں۔ مجھے کوئی حسین سی کہانی سناؤ۔ ایک
ایسی کہانی جو دھنک سے زیادہ حسین ہو اور جس میں پھولوں کی مہک ہو۔"

"آہ! میرے نوجوان دوست!" تم ابھی تک محبت بھری داستاں
کے متلاشی ہو۔ بھول جاؤ لیلیٰ مجنوں کے افسانے۔ فرہاد کو فراموش
کر دو، ہیر رانجھے کو اپنے ذہن سے جھٹک دو، سسی پنوں کی داستان کو
اپنے ذہن سے فراموش کر دو۔ اور۔ اور دنیا کے چہرے پر بہتے ہوئے
اس خون کو غور سے دیکھو۔ جو دنیا کے ذہنی انتشار کی نشاندہی کرتا ہے۔
فلسطین کے ان بچوں کی چیخوں کو سنو جو ہنسنے کی بجائے بلک رہے ہیں
ان ماؤں کی آہوں کو محسوس کرو جو اپنے شوہروں اور بچوں کو فوجی
جوتوں تلے روندتے ہوئے دیکھ کر خون کے آنسو رو رہی ہیں۔ اور امن
کی مریم ظلم کے جنگل میں اپنے آپ کو چھپانے کی ناکام کوشش کر رہی ہے۔

میرے دوست! ان شہیدوں کو یاد کرو۔ جنہوں نے اپنی جانیں وطن پر قربان کر دیں۔ ان شہیدوں کو یاد کرو جنہوں نے وطن کی آزادی کے لیے پھانسی کے پھندوں کو چوم لیا تھا۔ اور موت کی دہلیز پر کھڑے ہو کر قہقہے لگاتے تھے۔"

آواز جذباتی ہو گئی۔" ایک لمحے رکنے کے بعد وہ پھر بولا، اس کی آواز میں ایک نیا غرور پیدا ہو گیا۔!

"میں بوڑھا لاہور ہوں۔ میرے سینے پر تاریخ کے جانے کتنے گھوڑے سرپٹ دوڑتے رہے ہیں۔ میرے ذہن میں ہزاروں داستانیں محفوظ ہیں۔ لیکن ایک کہانی۔" ہاں اس کہانی نے ۱۹۶۵ء کی خونی کہانی سے زیادہ تاثر چھوڑا ہے۔ وہ کہانی دنیا کی بڑی کہانیوں میں بڑی کہانی ہے اور مجھے فخر ہے کہ اس کہانی نے میری گود ہی میں جنم لیا ہے۔"

ہاں تو تمہیں کہانی چاہیے۔ تو سنو!

" وہ ستمبر کی ایک خون رنگ رات تھی میرے سینے پر خون کی ہولی کھیلی جا رہی تھی۔ اور اس خون کی مہک نے سارے پاکستان کو منٹوں میں جھنجھوڑ کر جگا دیا تھا دشمن میرے سینے پر برابر گولے برسا رہا تھا اور میرے بیٹے اس کا جواب دے رہے تھے۔ وہ مطمئن تھے کیونکہ وہ حق کی لڑائی لڑ رہے تھے۔

اور اس وقت میں نے دیکھا ایک نوجوان دولہا سہاگ رات کو اپنی دلہن کا مقدس بوسا لے کر دشمن کی للکار سن کر وطن کی حفاظت کے لیے دوڑا۔ ہر ماں کا بہادر بیٹا اپنے وطن کی لاج رکھنے کے لئے بڑھا اور اس وقت میں بہت جذباتی ہو گیا۔ جب ایک اسی سالہ بوڑھا لاٹھی لے کر غصہ کی حالت میں ہانپتا کانپتا ہوا دشمن کی طرف دوڑ پڑا۔ یہاں تک کہ اس کا سانس پھول گیا۔ لاٹھی ہاتھ سے دور جا گری اور اس نے دم توڑ دیا۔ اف! کیسا منظر تھا وہ۔ وہ جذبہ کیسا تھا؟

میں نے دیکھا۔ میرے بہادر بیٹے اپنے سینوں سے بموں کو باندھ کر ٹینکوں کی طرف رینگ رہے ہیں ۔ اف! اف مرحبا! مرحبا! وہ کیا جذبہ تھا اور پھر ایک دھماکہ ہوا ۔ دشمن کے ٹینک بھسم ہو گئے، جل گئے اور میرے بہادر بیٹے؟؟ نہیں نہیں، ۔ وہ مرے نہیں۔ وہ آج بھی زندہ ہیں اور ہمیشہ زندہ رہیں گے ۔ شہید مرا نہیں کرتے وہ امر رہتے ہیں ان لوگوں کے لیے آج بھی رونے کو بے تحاشا دل چاہتا ہے ۔

اس وقت میرا سینہ فخر سے تنا ہوا تھا ۔ اس وقت کوئی نہ پنجابی تھا، نہ بلوچی، نہ سندھی تھا نہ مہاجر تھا، بلکہ سب ایک آواز تھے ۔ ایک ایسی آواز جو شدید ہوتی ہے اور غضبناک بھی! اس وقت میں کتنا خوش تھا ۔ میں نے سوچا تھا کہ کاش میرے بیٹے یوں ہی رہیں اور ان کی ایک آواز پاکستان بھر میں ہی نہیں بلکہ دنیا بھر میں یوں ہی سدا سلامت رہے!

میرے نوجوان دوست! تمہیں کہانی ہی لکھنی ہے تو ان مظلوم عورتوں کی کہانی لکھو ۔ جو مجبوراً عصمت کے بازار کی دکان پر سجادی جاتی ہیں اور چند سکوں کی خاطر اپنا جسم بیچنے پر مجبور کی جاتیں ہیں۔ ان مجبور لڑکیوں کی کہانی لکھو ۔ جنہیں تہذیب اور ثقافت کے کپڑے پہنا کر اپنے عریاں جسموں کی نمائش کرنے پر مجبور کیا جاتا ہے اور رات ہوتے ہی چند روپوں کے لیے کسی رئیس زادے کے پہلو میں لٹا دیا جاتا ہے۔ ان مظلوم اور معصوم بچّوں کی کہانی لکھو جو ظالموں کے ہاتھوں پڑ کر اپاہج کر دیے جاتے ہیں اور مال روڈ، بندر روڈ اور تلک چاڑی پر در در بھیک مانگتے ہیں ۔ اور چند سوکھے نوالے کھا کر سو جاتے ہیں ۔ اف ۔ اُف ۔ میرے خدا ۔ یہ کیسا وقت آگیا ہے ۔ بھائی بھائی کے خون کا پیاسا ہے ۔ میرے خدا زمانے کو کیا ہوتا جا رہا ہے ۔

سچ کہتا ہوں۔ جب کبھی میری نگاہ اپنے سینے کے زخموں پر پڑتی ہے
تو میرا سینہ اور بھی فخر سے تن جاتا ہے۔ کیونکہ یہ زخم بہترین دور کی عکاسی کرتے ہیں
لیکن جب میں راوی کے آئینہ میں اپنی شکل دیکھتا ہوں۔ جس پر میرے بیٹوں
نے حسد، نفرت، عیاشی اور برائیوں کے گہرے زخم ڈال دیے ہیں۔ تو میرے
آنسو نکل پڑتے ہیں۔ میں بے تحاشا رونے لگتا ہوں اور میرا سر ڈھلک جاتا ہے
اُف!" یہ کہہ کر بوڑھا لاہور خاموش ہو گیا۔!
تب اچانک میں نے محسوس کیا ہے۔ میرے کپڑے اچانک گیلے ہو گئے
ہوں۔ اور بدن کانپ رہا ہو۔
بارش ہو رہی تھی۔ اور چاند گہرے بادلوں کے مہیب اندھیروں میں
گم تھا۔
میں نے سوچا۔ کیا وقت کے آئینہ میں زندہ دلان لاہور نے اپنے
چہرے کی جھلک پھر دیکھ لی؟
شاید۔ شاید۔ پھر میں نے کہا۔" اے زندہ دلان لاہور! مہر نگار۔
اے روشنیوں کے حسین شہر۔ اے شہر لاہور تو مایوس نہ ہو۔ کیونکہ مایوسی موت
کا دوسرا نام ہے۔!"
اور جب میں واپس لوٹ رہا تھا۔ تو مال روڈ۔ شہر کے آنسوؤں سے تر
ہو چکی تھی۔! اور میری تخلیقی پیاس بھی بجھ چکی تھی۔

"ـــــ زندگی کے عذاب سے تنگ آکر وہ خودکشی کرنے شہر کی سب سے اونچی عمارت کی بیسویں منزل تک جا پہنچا، مگر خود غرض زمانے نے اس کی جان بچالی، یہ کیسی خود غرضی تھی۔ ـــــ"

بیسویں منزل، تیسرا آدمی

صدر بازار کے آخری سرے پر جو ایک اونچی عمارت کھڑی تھی اس کی بیسویں منزل کے آخری فلیٹ کے سب سے اوپری چھجے پر ایک آدمی بیٹھا ہوا نیچے کی طرف جھانک رہا تھا۔ اچانک انیسویں منزل کے ایک آدمی نے اوپر کی طرف دیکھا۔ اور اونچی آواز میں منہ اٹھا کر بولا۔ "کیا خودکشی کرنے کا ارادہ ہے؟"

آخری چھجے پر بیٹھا ہوا آدمی ذرا اور نیچے کی طرف کھسک کر بولا۔ "ہاں خودکشی کر رہا ہوں۔" اس کی آواز میں غصہ کی شدت تھی۔!

"مذاق کیوں کرتے ہو یار" ۔ انیسویں منزل کے آدمی نے ہنستے ہوئے کہا۔

"مذاق کرتا ہوں، ٹھٹھا کرتا ہوں۔ ہاں، ہاں مذاق کرتا ہوں۔ لیکن تمہیں کیا۔؟"

خودکشی کرنے والا غصہ سے چمک کر بولا۔ اور اس کی آواز سن کر عمارت کی ایک سرے سے دوسرے سرے تک کی ساری کھڑکیاں اچانک کھل گئیں۔ بچے عورتیں، مرد سب ہی اوپر منہ اٹھائے اوپر بیٹھے ہوئے آدمی کو دیکھنے لگے۔

"یہ کون ہے!! ۔ آخر چاہتا کیا ہے؟"

سب لوگوں کی نگاہوں میں طرح طرح کے سوال تھے۔ لیکن خودکشی کرنے والا آدمی بیسویں منزل کے آخری چھجے پر بڑے اطمینان سے بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا۔

اچانک سڑک پر چلتے ہوئے راہگیروں کی نظریں بھی اوپر اٹھنے لگیں۔ پہلے پیدل چلنے والے فٹ پاتھ پر رک کر اوپر کی طرف تماشا دیکھنے لگے۔ پھر موٹر سائیکل والے رکے اور اوپر کی طرف دیکھنے لگے۔ پھر کاریں، ٹیکسیاں بسیں رکتے رکتے پورا ٹریفک جام ہوگیا۔

"بات کیا ہے آخر۔؟" ایک سپاہی نے ٹریفک کو رکتے دیکھ کر پوچھا۔ "وہ دیکھتے نہیں بیسویں منزل سے ایک آدمی نیچے کودنے والا ہے۔" ایک راہ گیر نے اوپر اشارہ کرتے ہوئے بتایا۔

"کون ہے یہ۔؟" سپاہی نے مزید دریافت کیا۔

لیکن لوگ بڑی دلچسپی سے اوپر بیسویں منزل سے چھلانگ لگانے والے آدمی کو دیکھ رہے تھے۔ تھوڑی سی دیر میں بازار میں آدمیوں کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔

ایک مصوّر نے اپنے دوست کہا، کتنا پیارا منظر ہے۔ کاش اس وقت میرے پاس کینوس ہوتا تو میں اس منظر کو پینٹ کرتا۔ ذرا سوچو تو بیسویں منزل کے اوپری چھجے پر بیٹھا ہوا آدمی کس قدر عجیب لگ رہا ہے۔ اور اوپر کی طرف دیکھتی ہوئی حسین عورتیں۔!

مقامی اخبار کا رپورٹر اپنے ساتھی سے بولا "کمال ہے یار کتنا جی دار ہے یہ شخص آج شام اس کے لیے ضمیمہ نکالنا پڑے گا۔ اور یہ آج کی سب سے بڑی اور دلچسپ خبر ہوگی۔!"

شاعر نے اپنے لمبے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔" کتنا رومانٹک سین ہے محبت بھی عجیب چیز ہے۔ دیکھئے حضور کب نیچے کی طرف تشریف لاتے ہیں۔ اپنی محبوبہ سے روٹھے ہوئے معلوم

ہوتے ہیں۔"

ایک افسانہ نگار نے اپنے دوست افسانہ نگار کو یاد دلایا۔" اس آدمی کو دیکھ کر مجھے چیخوف کی مشہور کہانی کلرک کی موت یاد آگئی ہے۔ یہ بھی کوئی کلرک ہے بیچارہ۔"

" بکواس ہے۔ سب بکواس ہے۔ آخر یہ شخص کودتا کیوں نہیں۔؟" ایک شخص اپنی گھڑی دیکھتے ہوئے بولا۔

ایک دوسرا شخص اپنے ساتھی سے کہہ رہا تھا۔" یار میں تو بس یہ دیکھنے کے لیے کھڑا ہوں کہ یہ شخص نیچے کی طرف گرتے ہوئے کس طرح لگتا ہے۔؟"

کانسٹیبل پولیس چوکی کی طرف بھاگا۔" میں امدادی پولیس لے کر ابھی آتا ہوں۔ ایک بوڑھا شخص اپنے دوست سے کہہ رہا تھا۔" بھئی کمال ہے خودکشی کرنے والے جانے کیوں اس عمارت کا انتخاب کرتے ہیں۔ اس سے پہلے بھی اس عمارت کی بیسویں منزل سے پچھلے دنوں دو آدمی اور خودکشی کر چکے ہیں۔"

دوسرا شخص تعجب سے بولا۔" تو۔ تو یہ تیسرا شخص بھی؟"

تھوڑی دیر میں پولیس کی گاڑی بھی آگئی۔ پولیس انسپکٹر نے مجمع کو ہٹاتے ہوئے سیٹی بجائی۔ جب تمام آدمی ادھر ادھر تتر بتر ہو گئے تو اس نے اوپر بیٹھے ہوئے آدمی سے اونچی آواز میں نیچے اترنے کو کہا۔ لیکن اس کی آواز دوسری منزل سے زیادہ اوپر نہ جا سکی۔ تب اس نے ہاتھ کے اشارے سے آدمی کو نیچے بلایا لیکن بیسویں منزل کے آخری چھجے پر بیٹھا ہوا آدمی بڑے اطمینان سے سگریٹ پی رہا تھا۔ دو سپاہی لفٹ کی مدد سے بیسویں

منزل تک گئے لیکن چھجے پر قدم رکھتے ہی ان کے قدم ڈگمگانے لگے۔ اور دل دھڑکنے لگا۔

اس لیے انہوں نے کھڑکی سے منہ نکال کر چھجے کے اوپر بیٹھے ہوئے آدمی کہا، "نیچے۔ نیچے اترو۔ نیچے اترو۔!!"

"آخر کیوں۔؟" کیا بات ہے!؟ خودکشی کرنے والا آدمی بولا۔

"تم اوپر کیوں بیٹھے ہو۔؟ نیچے اترو۔ تمہاری وجہ سے ٹریفک رکی ہوئی ہے۔" سپاہی نے زور سے کہا۔

"میں خودکشی کر رہا ہوں۔ تم خاموش رہو۔" خودکشی کرنے والا آدمی ذرا اور نیچے جھک کر کانسٹیبل کو دھمکاتے ہوئے بولا۔

"آخر کیا بات ہے؟ تم خودکشی کیوں کر رہے ہو۔؟" دوسرے کانسٹیبل نے سوال کیا۔

"مجھے دنیا سے نفرت ہے۔ تم سب خودغرض ہو۔" اوپر بیٹھے ہوئے آدمی نے کہا۔ یکایک نیچے کھڑے ہوئے لوگ زور زور سے ہاتھ ہلانے اور چیخنے لگے۔

اوپر بیٹھے ہوئے آدمی نے پوچھا یہ لوگ کیا کہتے ہیں۔؟"

کانسٹیبل نے جواب دیا۔" کہتے ہیں جلدی کودو۔ جلدی کودو۔ کیونکہ انہیں کھڑے کھڑے بہت دیر ہوگئی ہے اور اب جلد ہی یہ تماشا دیکھ کر اپنے کاموں کو جانا چاہتے ہیں۔"

بیسویں منزل کے آخری چھجے پر بیٹھے ہوئے آدمی نے غصّہ سے نیچے کی طرف دیکھا جہاں بے انتہا آدمی ہاتھ ہلا ہلا کر اس سے نیچے کودنے

کا مطالبہ کر رہے تھے ۔ اس نے سگریٹ کا گہرا کش کھینچا ۔ اور پیچھے کی طرف
کھڑے ہوئے کانسٹیبلوں کی جانب ہاتھ بڑھا دیے ۔

"دل کے ہاتھوں موت اور زندگی کی کشمکش
میں مبتلا ایک ایسے شخص کا قصہ جس کے سینے
میں ایک دوسرا دل منتقل کر دیا گیا مگر پرائے دل
کی اجنبی اجنبی سی دھڑکنوں نے اس کی جان
لے ڈالی۔"

پرایا دل
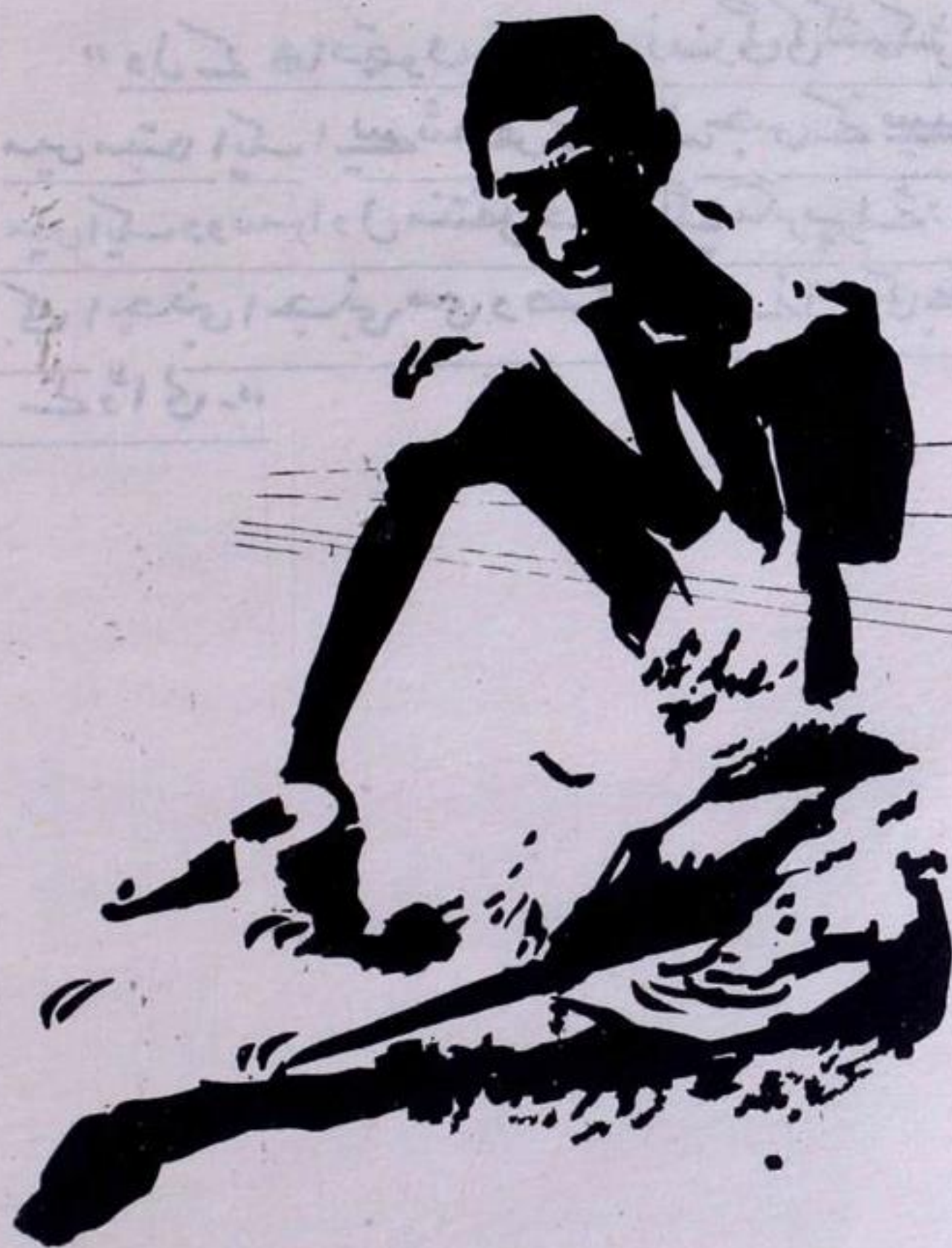
ناصر ابھی ابھی اپنی ڈسپنسری میں آکر بیٹھے ہی تھے کہ ملازم نے ان کے سامنے ایک پرچی رکھ دی۔ ڈاکٹر نے پرچی پر لکھا ہوا نام پڑھا اور جیسے خود ہی مسکرا دیے۔ پھر انہوں نے کہا، "ان صاحب کو بھیج دو۔"

ڈاکٹر ناصر اس مریض کے بارے میں سوچنے لگے جس کا انتقالِ قلب کا اپریشن انھوں نے پچھلے دنوں کیا تھا۔ یہ دل کی منتقلی کا ان کا پہلا کامیاب تجربہ تھا۔ اس کامیاب تجربے کی بنا پر ڈاکٹر کا نام ہر طرف نکلتے سورج کی روشنی کی مانند پھیل گیا تھا۔

اخبارات نے ان سے متعلق خبریں تصاویر کے ساتھ شائع کی تھیں اور ملک کے نامور صحافیوں نے ان کے انٹرویو نمایاں طور پر شائع کیے تھے۔ واقعی سائنس کی دنیا میں ڈاکٹر ناصر نے ایک بڑے کارنامے کا اضافہ کیا تھا۔

لوگوں کے درمیان جب بھی اس مشہور اپریشن کا قصہ دہرایا جاتا تو ڈاکٹر ناصر کے ساتھ ساتھ مریض عامر کا نام بھی بڑی دلچسپی کے ساتھ لیا جاتا۔ اس آپریشن کو ہوئے ایک ماہ کا عرصہ گزر چکا تھا، مگر اس بات کا چرچا ابھی تک لوگوں کی زبان پر تھا۔ اس اپریشن کی بنا پر ڈاکٹر ناصر ملک ہی نہیں بلکہ دنیا بھر میں ایک مشہور شخصیت بن گئے تھے۔ لیکن.... لیکن آج صبح ہی صبح وہ مریض اُن کے پاس پھر کیوں چلا آیا؟

ہلکی سی آہٹ کے ساتھ پردہ کھلا اور ڈاکٹر کا مشہور مریض عامر کمرے میں داخل ہو کر جیسے کرسی پر نڈھال ہو کر ساگر پڑا اس کے بال بکھرے ہوئے تھے اور ٹائی کی ناٹ ڈھیلی ہو کر نیچے کھسک آئی تھی اور چہرے سے وہ بے حد مضطرب دکھائی دیتا تھا۔

ڈاکٹر نے مسکرا کر اس سے مصافحہ کیا اور اس سے پہلے کہ ڈاکٹر اس سے اس کی خیریت دریافت کرتے وہ خود ہی جذباتی ہو کر بولا، "ڈاکٹر! خدا کے واسطے مجھے بچا لیجئے میں...... میں بے انتہا پریشان ہوں۔"

ڈاکٹر ناصر عادتاً مسکرائے "مجھے بتائیے آپ کو کیا تکلیف ہے؟"

مریض پھر جذباتی ہو گیا۔ "ڈاکٹر! پہلے بھی میں نے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر اپریشن کی اجازت دی تھی۔ اور آج پھر دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر میں آپ کے پاس آیا ہوں۔ خدارا ڈاکٹر۔ مجھے اس عذاب سے نجات دلایئے۔ یہ دل میرا نہیں۔ ڈاکٹر، یہ دل پرایا ہے اور اس کی دھڑکنیں میرے لیے اجنبی ہیں۔"

یکایک ڈاکٹر ناصر سنجیدہ ہو گئے، "مسٹر عامر! یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ یہ سب کیوں کر ممکن ہے؟ آپ جانتے ہیں کہ یہ تجربہ میری رات دن کی انتھک محنت کا پھل ہے۔ آپ کا دل تو بے کار ہو چکا تھا اگر میں یہ دل منتقل نہ کرتا تو یقیناً آپ آج زندہ نہ رہتے۔"

"کاش...... کاش یوں ہی ہوتا۔ ڈاکٹر، مجھے وہ موت پیاری تھی کاش میں پہلے ہی جانتا کہ پرایا دل پرایا ہوتا ہے، اس کی ہر دھڑکن اجنبی ہوتی ہے اور اس کی اپنی الگ خواہشات ہوتی ہیں۔ خدارا ڈاکٹر مجھے میرا پرانا دل لوٹا دیجئے۔"

"مسٹر عامر، بچے نہ بنیے۔ شکر کیجئے کہ آپ ایٹم کے اس دور میں سائنس

لے رہے ہیں جب کہ انسان موت پر عبور حاصل کرنے کی کوشش میں سرگرداں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ چند سالوں میں مردوں کو پھر سے زندہ کیا جا سکے اور یہ بھی اسی دور کی کرامت ہے کہ آپ کے سینے میں دوسرے انسان کا دل دھڑکتا ہے۔"

مریض پھر بے قابو ہو گیا، "کاش ڈاکٹر! میں پتھر کے اس دور میں پیدا ہوا تھا جب انسان اتنی اونچی باتیں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کم از کم میں جو آج تکلیف محسوس کر رہا ہوں، اس سے تو بچا رہتا۔"

ڈاکٹر نے پہلو بدلا اور مریض سے پوچھا، "آپ کس تکلیف کی بات کر رہے ہیں؟ میرے پاس ہر تکلیف کا علاج موجود ہے۔"

مریض طنزیہ بولا، "آپ اسے تکلیف کہہ رہے ہیں ڈاکٹر! میری روح درد سے کراہ رہی ہے۔ انسانیت میرے اندر ٹوٹ ٹوٹ کر بکھر رہی ہے اور میں اس نئے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر ایسے ایسے کام کرتا ہوں کہ خود مجھے اپنے آپ سے گھن آنے لگی ہے یقین جانیے ڈاکٹر، اپریشن سے پہلے میں بے حد شریف تھا۔ میرا دل ایک عورت سے آشنا تھا جو میری منکوحہ بیوی تھا۔ میں خود غرض نہیں تھا۔ میں نے کبھی شراب نہیں چکھی تھی، مگر آپ نے جب سے یہ اجنبی دل میرے سینے میں منتقل کیا ہے سچ جانیے ڈاکٹر، یہ دل چاہتا ہے کہ میں اپنی بیوی کو دھوکا دوں، بازاری عورتوں کے ساتھ رنگ رنگیلیاں مناؤں۔ یہ دل چاہتا ہے کہ شراب خانے میں اوندھا پڑا رہوں، میں چوری کروں، ڈاکے ڈالوں، ریس کھیلوں آپ یقین جانیے اس دل کے ہاتھوں میں مجبور ہو کر یہ سب باتیں کرتا ہوں۔ میں کتنا مجبور ہوں ڈاکٹر۔ یہ مجبوری کیسی ہے۔؟"

مریض کی باتیں سن کر ڈاکٹر ناصر عادتاً مسکرائے اور بولے، "میرے دوست! آپ کسی نفسیاتی بیماری کا شکار ہیں۔ آپ یہ شاید نہیں جانتے کہ سائنس نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ انسان کی حرکات و سکنات کا تعلق دل سے نہیں بلکہ دماغ سے ہے۔ دل تو صرف ایک ایسا آلہ ہے جو ہمارے جسم میں خون کے دوران کو یکساں قائم رکھتا ہے۔"

مریض ڈاکٹر کی بات کو کاٹتے ہوئے بولا، "ڈاکٹر اگر آپ میرا پرانا دل منتقل نہیں کر سکتے تو مجھے تھوڑا سا زہر دے دیجئے تاکہ میں اسے کھا کر مر جاؤں۔ میں نہیں چاہتا کہ میں چوری کروں، شراب پیوں، اپنی بیوی پر ظلم ڈھاؤں۔ میں پہلے جیسا شریف آدمی بننا چاہتا ہوں۔ خدارا! میری مدد کیجئے۔"

اچانک ڈاکٹر کے ذہن میں ایک عجیب سا خیال ابھرا۔ وہ جیسے اپنے آپ سے بولے، "ہو سکتا ہے! ہو سکتا ہے۔" پھر ڈاکٹر نے مسکراتے ہوئے مریض سے کہا، "آپ فکر نہ کریں، اس سلسلے میں آپ کی ہر ممکن مدد کرنے کے لیے تیار ہوں، لیکن کچھ دن کے لیے مہلت دے دیجئے۔ خدا نے چاہا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

مریض عامر جا چکا تھا اور ڈاکٹر ناصر کافی کی پیالی میں ڈوبے ہوئے بیڈ نمبر ۹ کے اس مریض کے بارے میں سوچ رہے تھے جس کا دل عین مرتے وقت نکال کر انھوں نے عامر کے سینے میں جوڑ دیا تھا یکایک، وہ اٹھ کھڑے ہوئے جیسے اچانک کسی فیصلے پر پہنچ گئے ہوں۔ فائیلوں میں سے انہوں نے بیڈ نمبر ۹ کے مریض کا ذاتی فائل نکالا اور مطالعہ کرنے لگے۔ ایک بار پھر وہ حیرت میں ڈوب گئے۔ بیڈ نمبر ۹ کے مریض کے ذاتی فائل میں سے

تحریر تھا، "یہ شخص عادی مجرم ہے، دو طوائفوں کو قتل کر چکا ہے، شراب پینا، جوا کھیلنا، اس کے لیے معمولی بات ہے۔ اچانک جیل سے فرار ہونے کی کوشش میں پولیس کی گولی لگنے کی وجہ سے اُسی طبی مدد کے لیے جیلر کے حکم سے ڈاکٹر ناصر کے پاس بھیجا جا رہا ہے۔"

یہ تمام باتیں ڈاکٹر ناصر کو معلوم تھیں، مگر وہ یہ سوچ بھی نہ سکتے تھے کہ ایک عادی مجرم کا دل بھی ایسا ہو سکتا ہے اسی لیے انہوں نے اس کے کردار کو اتنی اہمیت نہ دی تھی، مگر آج وہ واقعی پریشان تھے۔ کیا یہ تمام باتیں ممکنات میں سے ہیں؟ وہ ساری رات بستر پر کروٹیں بدلتے رہے۔ صبح کو وہ سرخ آنکھوں کو لیے ہوئے باتھ روم گئے اور پھر ناشتہ کرتے ہوئے اخبار پڑھا یکایک اُن کی نگاہیں ایک خبر پر جم گئیں۔

قاتل نے دو طوائفوں کو قتل کر کے خود اوپر کی منزل سے چھلانگ لگا دی

۲۲ فروری داستان رپورٹر) آج رات ۱۲ بجے ایک آدمی جس کا نام عامر تھا، بازارِ حسن کی دو طوائفوں کو اس نے بے دردی سے قتل کر دیا اور دیوانہ وار دوسری منزل سے نیچے چھلانگ لگا کر خود بھی ہلاک ہو گیا۔ یاد رہے کہ قاتل عامر وہی مشہور مریض تھا جس کے قلب کا اپریشن مشہور سرجن ڈاکٹر ناصر نے کیا تھا اور اس کے سینے میں ایک دوسرے انسان کا دل بڑی کامیابی سے منتقل کر دیا تھا۔ مزید انکشافات کا انتظار ہے۔

ڈاکٹر ناصر نے اس خبر کو کئی بار پڑھا، پھر وہ بڑبڑائے، "ایٹم کے اس ترقی یافتہ دور میں بھی ہم قدرت کے ہاتھوں کتنے بے بس اور مجبور ہیں۔"

"ایک ایسے مفلس اور بھو کے لڑکے کی کہانی،
جس نے پیٹ کی خاطر سمندر میں صرف
دس نئے پیسے کے لیے اپنی جان گنوا دی ۔
زندگی کا ایک بھرپور المیہ ۔"

دس پیسے کا سکّہ

میری شادی ہوئے ابھی کافی عرصہ نہیں ہوا۔ میری بیوی میری طرح خوش مزاج اور حسین ہے۔ میری طرح اسے بھی سمندر پر مچلتی لہریں اور مچلتی لہروں پر بادبانی کشتیاں، بادبانی کشتیوں میں ملاحوں کے ڈوبتے ہوئے ابھرتے گیت پسند ہیں اور کبھی کبھی وہ چاند کا چہرہ تکتے تکتے سب کچھ بھول جاتی ہے اسے قوس و قزح کے رنگوں سے پیار ہے اس لیے وہ گہرے گہرے رنگوں والیاں ساڑھیاں استعمال کرتی ہے۔

ہر ہفتے کی رات ہم کسی اچھے ہوٹل میں ڈنر کرتے ہیں اور آخری شو دیکھ کر زندگی کے حسین ترین شو میں غرق ہو جاتے ہیں۔ اتوار کی صبح ہم دیر تک سوتے رہتے ہیں۔ ہفتہ کی شام ہم سمندر کے کنارے دیر تک سمندر پر مچلتی ہوئی لہروں کو دیکھتے رہے۔ شام ڈوب رہی تھی... اور ہوا ہلکی ہلکی چال چل رہی تھی اور مغرب کی طرف شفق پھوٹ رہی تھی۔ "یہ کس کا خون آسمان پر بکھر گیا ہے؟" یکایک میری بیوی نے مجھ سے پوچھا۔ "قدرت کے حسن کو خون کہتی ہو پگلی" میں نے اس کے چہرے پر شریر لٹ کو چھیڑتے ہوئے کہا۔ دور سمندر کی سطح پر کئی کشتیاں ہچکولے کھا رہی تھیں۔ چٹ پٹ چنے بیچنے والا ادھر سے ادھر آوازیں لگاتا ڈول رہا تھا اور ہم سمندر کے بالکل کنارے کھڑے ڈوبتی شام اور پھوٹتی شفق اور اڑتے ہوئے پرندوں کی چہک محسوس کر رہے تھے۔

"بابو جی کرتب دکھاؤں کیا۔؟" ہمارے قریب آ کر پانچ سالہ لڑکے

نے کہا۔

"کرتب۔!" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں جی — صرف ایک روپیہ آپ پانی میں پھینکو۔ اور میں غوطہ مار کر نکال لاؤں گا۔"

"کمال ہے۔"؟ میری بیوی نے میری طرف دیکھ کر کہا

"مگر روپیہ تو بہت ہے۔" میں نے سودا کرنا چاہا۔

"تب بابوجی آٹھ آنے ہی پھینکو۔۔۔ ننگا ملنگا لڑکا میری طرف دیکھ کر بولا۔" صبح سے آج بکھری نہیں ہوئی صاحب صبح سے بھوکا ہوں۔"

"ہم سب بھوکے ہیں۔" میں نے بے رخی سے کہا۔ دنیا کا ہر انسان بھوکا ہے۔ اور ہوس شاید کسی کی عمر بھر نہ پوری ہو سکے۔ ہم جتنا کماتے ہیں اتنا ہی کم ہے۔"!

"پھر بیگم صاحب۔" لڑکے نے میری بے رخی دیکھ کر میری بیوی سے کہا اور بیوی کے بجائے میں نے جیب سے دس پیسے نکال کر ہوا میں اچھالتے ہوئے کہا۔" اگر دس پیسے لینے ہیں تو کرتب دکھاؤ۔ ورنہ اپنی راہ لو۔"

"دس پیسے؟" لڑکے نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔

"اوہ" دیکھو دیکھو۔ ابھرتا چاند کس قدر حسین لگ رہا ہے۔ یہ ہوا، سمندر کا اڑتا ہوا جھاگ، اور حسین رات" اف کتنا اچھا لگتا ہے"۔ میری بیوی نے پر کیف ماحول سے متاثر ہو کر شاعری کی۔

"پیٹ میں روٹی۔ اور جیب میں پیسہ ہو تو سب کچھ اچھا لگتا ہے۔" لڑکے نے جل کر کہا۔ اور "پھر" وہ سمندر کے اور قریب ہو گیا۔ جیسے کرتب دکھانے کے لیے تیار ہو۔

میں نے اپنی بیوی کا نرم ہاتھ تھاما اور لڑکے کے قریب ہوگیا۔ لڑکے نے میری طرف دیکھا۔ جیسے کہہ رہا ہو۔" دس پیسے ہی پھینکو نا ؟"

دس نئے پیسے کے سکے کو میں نے ایک بار ہوا میں اچھالا اور سمندر میں پھینک دیا ۔ اور اس لمحہ لڑکے نے بھی سمندر میں چھلانگ لگا دی ۔ میری بیوی لڑکے کی اچانک حرکت پر گھبرا سی گئی ۔ اور میں نے اس لمحہ کچھ ایسا محسوس کیا جیسے کسی نے گوشت کا ایک چھوٹا ٹکڑا اپنے آنگن سے ہوا میں اچھال دیا ہو اور ہوا میں اڑتا ہوا بھوکا گدھ اس پر ایک دم جھپٹ پڑا ہو۔

لڑکے کے سمندر میں کودنے سے پانی اوپر کی طرف اٹھ گیا ہو۔ پھر لہروں کا ارتعاش بڑھ گیا اور پھر لہریں ابھرنے اور ڈوبنے لگیں۔ کئی سیکنڈ تک ہم سمندر کو غور سے دیکھتے رہے ۔ میں نے سوچا ۔" سمندر کتنا امیر ہے ۔ وہ سونا بھی اگلتا ہے اور خوبصورت سیپیاں بھی! اور سمندر کتنا حسین ہے ۔ جسے دیکھ کر ہم اپنے دکھ اور غم کچھ دیر کے لیے بھول جاتے ہیں ۔!

جب کافی دیر ہوگئی اور لڑکا سمندر سے نہ ابھرا تو میری بیوی نے میری طرف دیکھ کر کہا ۔" لڑکا کہاں گیا ؟" تم نے نہیں دیکھا ۔ ؟ وہ پیسہ کی تلاش میں کودا تھا ۔ اور اسی کی تلاش میں سمندر سے لڑ رہا ہے اور کچھ دیر بعد وہ دس پیسے کا سکہ لے کر مسکراتا ہوا نکلے گا اور اپنی بھوک مٹائے گا ۔ لیکن چار منٹ بعد بھی لڑکا سمندر سے نہ نکلا ۔ میری بیوی نے پھر گھبرا کر پوچھا ۔" سنتے ہو ۔ لڑکا کہاں گیا ۔" ؟

"لڑکا ۔ ؟" اب کی بار میں بھی پریشان تھا کہیں سمندر نے اسے نگل نہیں لیا ۔ میں نے گھبرا کر سوچا ۔

"سمندر اتنا بے رحم نہیں ہو سکتا" میری بیوی نے گھبرا کر خود سے کہا۔

پھر میں نے کچھ ایسا محسوس کیا۔ جیسے لڑکا ہچکولے کھاتی ہوئی کشتی میں بیٹھا اسے کہہ رہا ہو اور ملاحوں کے گیت نوحوں میں تبدیل ہو گئے ہوں۔ اور شفق نے خون کا روپ دھار لیا ہو۔ "کسی نے ہمیں دیکھ لیا۔ تو۔ تو" میری بیوی نے مجھے یاد دلایا۔ ہم دونوں تیزی سے پیچھے کی طرف بھاگنے لگے۔ اب مجھے کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا صرف موہوم موہوم سی آوازیں سنائی دے رہی ہیں۔

دس نئے پیسے کا سکہ۔ موت۔ زندگی۔ بھوک۔ خون !!!
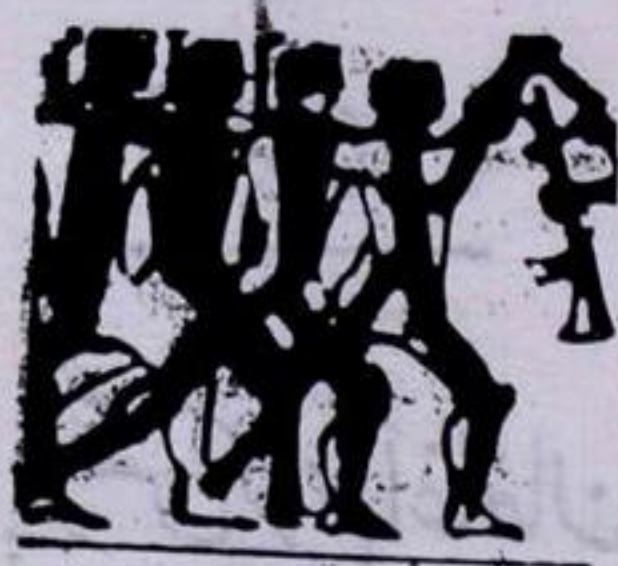
توصیف چغتائی

کی

غیر مطبوعہ کتب

پرنس کریم آغاخان

(حیات و کارنامے، انگریزی)
غیر مطبوعہ

تصویرِ بتاں

(فلمی انٹرویوز)

ردو کا ایک دیوانہ سا
کی افتتاحی تقریب
ڈرامہ نگار